# شاہین و دراج

تصنیف

حضرت علامہ راشد الخیری

# شاہین و درّاج

(مصور غم) علامہ راشد الخیری مرحوم

قیمت۔ بارہ آنے

ناشر:۔ عصمت بکڈپو لکھنؤ۔ پرنٹر:۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

# دُرّاج

خوشا نصیب سرزمین زابلستان! کیسے کیسے گوہر آبدار جن کی چمک سے تمام ایران جگمگا اٹھا۔ آخرکار تیری گود میں آلیٹے۔ خدا کی شان! وہ بیابان جن کے بگولے آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ اُن باکمال لوگوں کی خوابگاہ بنے جو مرتے مر گئے۔ اور استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔

زابلستان! تو مٹ چکا! تیری عمارتیں مسمار! تیرے محسن ڈھنڈار! تیری آبادی برباد! اگر تو لاکھ تاراج ہو جائے۔ تیری خاک میں وہ لاجواب ذرے چھپے ہیں جن کی آب و تاب آج بھی ویسی ہی ہے جیسی تین سو برس پہلے تھی۔ تیرے کونے کھدرے تیرے پہاڑ اور کھنڈر ایسے خیالات کے خزانے ہیں جن پر زمانہ مدت العمر ناز کرے گا۔ تیرے کھنڈروں میں وہ مٹی ہوئی صورتیں آرام کر رہی ہیں جن کا نام صفحۂ روزگار سے مٹنے والا نہیں۔

یلغاری قبرستان! تیرے مہمان قیامت تک کروٹ نہ لیں۔ ان کی ہڈیاں گل جائیں۔ ان کی قبروں کے نشان تک مٹ جائیں۔ مگر سچی محبت کا سہرا اُن کے سر رہے گا۔ ان کے سچے اصول ایسے شاداب پھول ہیں کہ خزاں تمام دنیا کو برباد کر دے۔ مگر یہ اُس وقت تک لہلہاتے رہیں گے جب تک کارخانۂ قدرت میں چشمِ بینا موجود ہے۔

کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بیچاری آتا قندھاری قوم سے یلغاری نسل سے تاتاری مفلس غریب خاتون کی ماری اس ناداری میں ایسا لعل بے بہا جن رہی ہے۔ جو ملکۂ شاہین کے گلے کا ہار ہوگا اور یہ مرزا دراج دو دو دانوں کو محتاج سچی محبت کی ایسی لاج رکھے گا کہ کیا طہران اور کیا اصفہان کیا آذربائیجان اور کیا مازندران تمام

ایران اس پر فخر کرے گا۔

تعجب ہوتا ہے۔ کہ وہ گھر اور نہ صرف گھر بلکہ خاندان جس کا بچہ بچہ منتقی اور بے ایمان۔ اس میں ایک ایسا شخص پیدا ہو جو آسمان محبت پر چودھویں کا چاند ہو کر چمکے۔ اور عقل کام نہیں کرتی کہ ایسا وحشی جس نے کبھی آنکھ کھول کر تہذیب کو دیکھنا کیسا سُنا بھی نہیں خلق سے کوسوں دور انسانیت سے محروم ایسا مظلوم بنے کہ شہر کا بچہ بچہ اس کے نام پر آنسو بہائے۔

شاہین و دُرّاج کے تعلقات عشق تھے۔ یا محبت کم تھے۔ یا زیادہ۔ تھوڑے تھے یا بہت۔ اچھے بُرے۔ جائز ناجائز۔ صحیح غلط جو کچھ بھی تھے۔ اور جیسے بھی تھے اتنے ضرور تھے۔ کہ آج ایرانی مغل اس کی جانفشانی پر جس قدر فخر کریں نہایت درست اور بجا۔

یلغاری خاندان بُرا مانے تو مانا کرے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے۔ کہ ہم کو تو اُمید بھی نہیں کہ دُرّاج اس آن کا آدمی نکلے گا۔ کہ جان و ایمان سب کچھ قربان کر دے مگر اپنی شان کو ہاتھ سے نہ دے۔ ہم جانتے ہیں۔ کہ دُرّاج جو مانگتا وہ ملتا اور جو چاہتا وہ لیتا۔ اس افلاس اور عسرت میں بھی کہ کم بخت فاقوں پہ فاقے کرتا۔ اچھے اچھے صوبہ دار اُس کے آگے آنکھیں بچھاتے۔ خاص محلہ شنادر پور کے سردار جن کے گھروں میں سونے چاندی کے ڈھیر اور زر و جواہر کے انبار لگے رہتے۔ اس فقیر کے اوپر سے بھر بھر جھولیاں نثار کرتے اور وہ اللہ کا بندہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ ان سب جھگڑوں کو جانے دو۔ کیسے رئیس اور کس کے سردار خود ملکہ شاہین اگر جھوٹوں اشارہ پاتی۔ تو سچ مچ دُرّاج جو کفن کو بھی محتاج مرا۔ ہیرے اور موتیوں سے مالا مال ہوتا۔ مگر صد آفریں آغا کے لال! ایرجموں میں پلا۔ سفاکوں میں بڑھا۔ ظالموں میں رہا۔ مگر وہ نام کر گیا۔ کہ جب تک

۵

چمنستانِ خیال میں محبت کے بار آور نہال موجود ہیں خلوص کے شیدائی تیری حسرت پہ روئیں گے صداقت کے دریا تیرے پاؤں میں لوٹیں گے۔ اور اے دُرّاج اگرچہ تو مر چکا۔ مگر محبت کا وہ تاج تیرے سر پہ ہے جس کے جواہرات تمام عالم کو منور کر رہے ہیں۔

# شاہین

شاہین والیٔ سلطنت تھی تو رعیت کو بھاگ اور حسن میں بے نظیر تھی تو میاں دزراج کی خوش نصیبی۔ ہاں اتنا کہنے کا حق ہم کو بھی ہے کہ بلغاریوں پر ایسا زبردست احسان کر گئی کہ جب تک اس خاندان کا ایک متنفس بھی زندہ ہے ہمیشہ مالامال رہے گا بھیک مانگنے والے فقیر شاہین ہی کا دم تھا کہ پوتڑوں کے امیر بن گئے۔ بلغاریوں کا گروہ کتنا ہی بڑھ بڑھ کر بولے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ عمر بھر تے کریں تو شاہین کا نمک اُن کی انتڑیوں سے نہیں نکل سکتا خود دُزراج کے آخری الفاظ جو اس راز کا انکشاف کر رہے ہیں صاف صاف بتاتے ہیں کہ جیا تو شرمندۂ احسان جیا۔ اور مرا تو قربان ہو کر مرا۔

اس اقرار سے انکار نہیں کہ مرزا بدنصیب نے تکلیفیں بھگتیں مصیبتیں جھیلیں۔ ظلم و ستم کی بوچھاڑ۔ رنج و الم کی بھرمار پے درپے صدمات لگا۔ تار تکالیف و آفات غرض جو کچھ ہونا تھا سب ہی کچھ ہوا۔ مگر بلغاری خاندان گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ کجا ملکہ شاہین ایک عظیم الشان سلطنت کی مالک تین سرتاجوں کی سرتاج۔ کجا بیچارہ دُزراج بیقرار صورت حبشیانہ مزاج۔ شاہین سی ملکہ اور دُزراج کا جوگ کجا گنگو تیلی کہاں راجہ بھوگ!

ہم کو اس سفارش کی ضرورت تھی نہ ہے کہ شاہین کی غلط فہمی قابل معافی ہے۔ ہاں جہاں دُزراج کو بے قصور ثابت کرنا ہمارا کام ہے وہاں یہ کہہ دینا بھی ضرور ہے کہ شاہین پر خواہش نفسانی کا الزام صریح بہتان ہے۔ خدا ترس رحم دل۔ اپاہجوں کا سہارا۔ غریبوں کا گزارہ بیکسوں کی رفیق یتیموں کی شفیق۔

محتاجوں کی مددگار مصیبت ماروں کی غمگسار عیب کو نقص بتاؤ۔ اعتراض کرو۔ کچھ ہی کہو کچھ ہی کرو صرف اتنا تھا کہ جہاں بات کی سچی تھی۔ وہاں کانوں کی کچی۔ مگر ہاں دُرّاج کے معاملے میں شروع سے آخر تک شاہین پر ایک حرف نہیں آسکتا۔ ابتدائی شفقتوں اور مہربانیوں کو دیکھو خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ دُرّاج کو خواب میں بھی یہ عزت نصیب ہوئی ہوگی۔ مگر اس بغلی گھونسے کا کیا علاج جب موقع اور رُخ دیکھا ایسی ایسی جڑیں کہ بدگمان کر کے چھوڑا۔ جو لکھا تھا وہ پورا کیا۔ اور جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ شاہین جو کچھ بھی تھی لونڈی نہ تھی۔ باندی نہ تھی۔ آخر تھی تو ملکہ بدگمانی کے ملے ہوتے۔ اوپر سے لگائی بجھائی عورت ذات صفائی ہوئی نہیں۔ بات تھی کہ دل میں بیٹھ گئی۔ ایک نہیں پچاس واقعات ملکہ شاہین کے ایسے نکلیں گے کہ سینکڑوں کوس سے لوگ اس کے دربار میں روتے آئے اور ہنستے گئے۔ فریاد لیکر آئے اور مراد لے کر گئے۔ کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ کہ اگر کہیں معاملہ کا اظہار ہو جائے تو شاہین ملکہ تھی تو کیا اس شان کی عورت تھی کہ دُرّاج کے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔ مگر تقدیر کا لکھا کون ٹالتا اور کیوں ٹلتا۔ دُرّاج کا انجام جو ہونا تھا۔ وہ ہوا اور شاہین کی قسمت میں بدنام ہونا تھا وہ ہوئی۔ پھر بھی ہم اس راز کے اختتام پر اتنا کہنے سے باز نہ رہیں گے کہ گو سینکڑوں برس گزر گئے۔ نہ ملکہ رہی نہ دُرّاج نہ ستم رہا نہ کرم نہ وہ وقت رہا نہ بات۔ مگر اسے خوبیوں بھری ملکہ تو ہر الزام سے بری ہے۔ تیرا تاج شاہانہ محبت کے ایسے پھولوں سے آراستہ ہے جو تمام دنیا کو معطر کر رہے ہیں۔

# نوروز اور شاہین کی سواری

جشن کی تیاری یوں تو دنوں کیا مہینوں ہی سے ہو رہی تھی۔ مگر ماہ بہشت میں تو ایران کا بچہ بچہ اسی ساز و سامان میں مصروف تھا۔ رعیت شاد شہر آباد لوگ خوشحال دل چونچال جو کچھ ہوتا وہ کم اور جو کچھ نہ ہوتا۔ وہ تھوڑا محل شاہی کا تزک و احتشام سواری کی دھوم دھام پختہ سنگین سڑکیں۔ دھلی دھلائی بلور کی طرح صاف شفاف دو کانوں پر بیلیں چڑھی ہوئی جھاڑ فانوس لگے ہوئے۔ زابلستان تو آنا فاناً منہ سے بول اٹھا۔ سواری کا دن آیا تو صبح چار بجے سے ہزاروں بندگان خدا گھر بار چھوڑ چھاڑ بازار میں آ کھڑے ہوئے عجیب پر لطف وقت اور بہار کا سماں تھا کہ دور دور سے لوگ دیوانہ وار جوق در جوق چلے آتے تھے۔ طلوع آفتاب تک کوٹھوں کا تیں اور بالاخانے مردوں اور عورتوں سے اٹ گئے تھے۔ وہ ٹھیک پچ تھی کہ ایک پہر ایک گر ا ٹھرتا اٹھا خدا خدا کر کے داخلہ سواری کی طرف چلی۔ ہاتھیوں کی قطار زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی سونے چاندی کی عماریاں کسی ہوئی پیچھے فوج شاہی کا جلوس یہ سب کچھ ہو چکا تو سواری کی آمد آمد ہوئی۔ اور چاروں طرف سے "ملکہ بلند اقبال" کی صدائیں شروع ہوئیں۔

شہزادی ایک مشکی گھوڑے پر سوار تھی پر نقاب خراماں خراماں رعیت کو دیکھتی بھالتی سلاموں کے جواب دیتی دلاتی چلی آتی تھی۔ خوشی کا وقت جشن کا روز کامیابی کی توقع انصاف کا یقین سینکڑوں اللہ کے بندے اپنی اپنی حالت زار کا اظہار کر رہے تھے محتاج صدقات سے مالا مال مظلوم دادرسی سے نہال ایسی اچھی گھڑی تھی کہ بڑے سے چھوٹے تک جس کے چہرے پر نظر پڑتی تھی ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا۔

محافظین کا گھیرا دو ہاتھ ننگی تلواریں کمر میں ایرانی خنجر دائیں بائیں آگے پیچھے ترقی دولت و درازی عمر کے نعرے مار رہا تھا۔ دفعتاً ایک طرف سے بندوق کی آواز جس نے نہ صرف ملکہ اور فوج شاہی بلکہ تاتاری اور ایرانی شہری اور سیلانی سب کے کان کھڑے کر دیئے۔ تمرچی نے اندیشہ کا بگل بجایا اور محافظین کا دستہ سمٹ سمٹا کر ایک جگہ جمع ہو گیا۔ ادھر شہزادی ششدر و حیران اُدھر فوج شاہی سراسیمہ و پریشان۔ ابھی اطمینان نہ ہوا تھا کہ دوسری گولی شاہین کے پاس سے سائیں سائیں کرتی ہوئی نکل گئی، جادو کا سا کارخانہ تھا۔ چاروں طرف لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ مگر خاک پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ واردات ہے کیا۔ بڑے بڑے بہادر اور اچھے جری دنگ کھڑے تھے کہ یہ آفت ناگہانی زمینی ہے یا آسمانی۔

شیر افگن خاں جیسے سپہ سالار کی دلیری اور مرزا شجاع جیسے جری کی شجاعت دھری کی دھری رہ گئی۔ اور تیسری گولی نے عربی النسل گھوڑے گلشن افروز کو جو جشن نوروز کے واسطے مخصوص تھا ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

دشمن تو اپنا کام کر ہی چکا تھا اور سچ پوچھو تو شاہین کی موت میں کوئی کسر نہ رہی تھی۔ مگر کچھ تقدیر ہی کی زبردست تھی کہ سپہ سالار کی نظر اتفاق سے فصیل پر جا پڑی۔ دیکھا تو ایک شخص کنگورے کی آڑ میں بیٹھا توڑا سلگا رہا ہے۔ اب کیا تھا سیکڑوں دوڑ پڑے۔ مگر وہ شقی انقلاب کیا چیز کہنے والا تھا جب تک گرفتار ہو۔ ملکہ کی شست باندھ دست بخیر ایک فیر اور کیا۔ ایسے خطرناک وقت میں یلغار ہی خاندان کی وفاداری قابل داد تھی۔ نمک خوار اور جاں نثار ملازم اور وفادار سب ہی موجود رہتے مگر ایک کی ہمت نہ پڑی کہ حق نمک ادا کر جاتا۔ یہ فخر تھا تو دراج کی تقدیر میں۔ محافظین میں شریک نہ فوج میں شامل۔ سپاہیوں میں بھرتی نہ اردلی میں داخل۔ سب ساتھیوں کو چھوڑ چھاڑ آگے بڑھا اور ملکہ کو آڑ میں لے کر دیوار آ کھڑا

ہوا۔ یہ مرزا کی خوش نصیبی تھی کہ گولی خالی گئی۔ قریبی رشتہ دار اور پشت در پشت کے نمک خوار کھڑے کے کھڑے رہے اور قاضی پور کا وحشی سب سے بازی لے گیا۔

ملکہ شاہین کی یزدانی کے عہد سے ایرانیوں میں یہ نئی رسم ایجاد ہوئی تھی کہ جشن نوروز دریائے ماہون میں منایا جاتا تھا۔

سلطنت کے معزز اہلکار کرسی نشین اہل دربار خاندان شاہی کے رشتہ دار سال بھر تک اپنی اپنی کشتیاں تیار کرتے تھے۔ آبنوس و شیشم کے تختے زمرد و جواہر کی پچی کاری زنگارنگ کے پردے انواع و اقسام کی گلکاری نیچے رومی و کاشانی مخمل اور ایرانی اور زابلستانی قالین۔ جواہر نگار کرسیاں پھولوں کے ہار پڑے ہوئے غرض کچھ ایسے تکلفات ہوتے تھے کہ رفتار دربار میں بھی ایک انداز محبوبانہ پیدا ہو جاتا تھا۔

باغی گرفتار ہو کر سر بازار سولی دیا گیا۔ خیرخواہان سلطنت رستے بھر روپے اشرفیاں لٹاتے رہے۔ اور سواری شاہین شہر سے ہوتی ہوئی کنارۂ دریا پر پہونچی دستہ تاتاری نے سلامی دی۔ بندوقوں کی گرج سے تمام میدان دھواں دھار ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف ملکہ شاہین کا اقبال تھا کہ بال بال بچی۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ نہال نہال ہوتی بالکل افسردہ تھی۔ چپ چاپ چلی اور گم سم آئی۔ اتری تو مغموم کھڑی ہوئی تو افسردہ بیٹھی تو محزون اور لیٹی تو مردہ۔

شاہین کی خاموشی نے ساری خوشی مٹی کر دی۔ اور دریائی جشن پر بالکل پانی پھیر دیا۔ حقیقت کے ارمان دل کے دل ہی میں رہے۔ نذریں تو درکنار کسی کی اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ بات تک کر لیتا۔ طواف تیموری کی رسم جو پرانی تھی اور خاندانی تھی اور یزدانی کے زمانہ سے چلی آتی تھی ضروری سمجھی گئی اور مجبوری ادا کرنی پڑی۔

طواف تیموری سلطان علاؤالدین کا رومال اور رابعہ اول کی چوٹی کا سرباند

تھا جس کے گرد طواف کرنے کے بعد والئ سلطنت تخت زابلستان کی ترقی کے لئے دعا کرتا تھا گنتی کے دو چار آدمی جو خاندان شاہی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ اس رسم کے ادا کرنے میں شریک ہوتے تھے۔ اور اختتام دعا پر امراء، وزراء مع فوج شاہی آمین پکارتے تھے۔

ملکہ کی افسردگی نے وہ تمام سماں درہم برہم کر دیا۔ البتہ مراحم خسروانہ یا جان بچانے کا احسان جو کچھ تھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ مرزا دُرّاج کو اس رسم میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی۔ شاہین کی افسردگی اور اضمحلال لمحہ بہ لمحہ ترقی کرتا جاتا تھا۔ طواف تیموری پہلے ہی سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ بادل ناخواستہ گئی طواف کیا اور برائے نام دعا مانگ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اراکین شاہی سلام کے منتظر تھے چھت پر آئی اور تمام فوج کو رخصت کیا۔

محافظین کا ایک مخصوص دستہ تیار و کمربستہ کنارہ دریا پر موجود رہا۔ کام کاج کے لونڈی غلام اور مرزا دُرّاج کشتی کے زیریں حصے میں تھے اور شاہین چھت پر لہروں پر نظر ڈال کر خدا معلوم کس خیال میں غرق ہوئی۔ کبھی دن ڈھل گیا اور وہ اپنی جگہ سے نہ سرکی کس کی مجال تھی کہ دم مارتا۔ کیسا قد غریب دُرّاج پہ سنسنی آتی رہتی۔ ابھی جان بچائی۔ کبھی دن بھر بھوکے مرے۔ کنارے کی فوج اسی طرح بندھی سو گئی۔ ملکہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

بسا غنیمت تھا کہ ابر غلیظ چھایا رہا۔ ورنہ زابلستان کی گرمی الامان الحفیظ! آخر آسمان نے طوطے کی طرح دیدے بدلے اور چلچلاتی ہوئی دھوپ نے چھکے چھڑا دیئے۔ دوپہر کا سنسان وقت اور ہوں کا سناٹا اتنے بڑے دریا میں لے دے کر ایک کشتی اس میں بھی گنتی کے چند آدمی۔ وہ بھی اول تو لونڈی غلام اور کچھ پیاسے غرض ایک ہو کا میدان تھا۔ چاہیے کہ شاہین محلوں کی بیٹھنے والی چڑیوں کی سو رہنے

والی زود رنج ۔ عالی دماغ ۔ سریع الغضب ۔ نازک مزاج ۔ آفتاب کے اُس پیچ و
تاب سے گھبرا جاتی ۔ لہٰذا غضب کی دھوپ کو جیل انڈا چھوڑ سے سب اُس
کے سر پہ تھی ۔ ماں بہشت کا سہارا ۔ سا دن صاف گزر گیا ۔ اور کیا مجال جو اُس کے منہ
چند اُڑ کے دوا نہ گیا ہو ۔ سورج اپنی گرمیاں دکھا دکھا کر رخصت کے قریب پہنچا ۔ اور
آسمان نے ایک دوسری کروٹ لی ۔ اب جھٹ پٹا وقت تھا ۔ جھونکوں کی آہ رنگ
لائی ۔ ترنگ بیگانوں ابر سیاہ سے گھرا اور کالی گھٹا نے اندھیرا گھُپ کر دیا ۔ ہوا سرسراہٹ
سے جھونکے اور جھونکوں سے جھکڑ بنی ۔ پانی جو تھوڑی دیر پہلے مستانہ وار اترا اترا کر
بہہ رہا تھا گرجوں اور اچھلنے لگا ۔ دونوں ملاح ہوا کا رنگ دیکھ کر دنگ رہ گئے ۔
مگر کس کی مجال تھی کہ دم مار سکتا ۔ کشتی سفری کشتی بکی بھالی دو ہی جھونکوں میں کہیں
پہونچی ۔ یہ سب کچھ ہوا ۔ ملکہ بھی اندرکی بیٹری اپنی جگہ سے سرکنا تھی اور نہ سرکی ۔
کسی اور کی ہمت تو پڑی نہیں ۔ ایک بیچارہ دُرّاج ہی دکھائی دیا ۔ کہ اُس نے اُڑ میں
آکر جان بچائی اسی غریب کو اٹھ پیر دکھ کر ملکہ کی خدمت میں روانہ کیا ۔

دُرّاج ایک اکھڑ گنوار تہذیب سے آشنا ۔ آداب شاہا شہ سے بے خبر ۔ اور اس
کو آپ اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے ۔ وہ یقین کر چکا تھا کہ میں لاکھ تیراک
مگر اس طوفان میں خاک پیش نہ جائے گی ۔ مرتا کیا نہ کرتا ۔ دل کڑا کیا ۔ اور اوپر پہنچا
شاہین جو ہرا عالی سلطنت کے ایسے کو لت سے اہم معاملات چھوڑ کر دیکھی تھی ۔ اور
کیا اُلجھن سلجھا رہی تھی ۔ کہ دُرّاج کے پاؤں کھڑے کھڑے شل بھی ہو گئے ۔ اور
ملکہ نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ۔ دُرّاج بدنصیب عجیب مصیبت میں پھنسا ہوا تھا ۔
بھوک کے مارے جان نکل رہی تھی ۔ طوفان کے مارے ہوش اڑے جاتے تھے ۔
سوچتا تھا کہ آج ایسے کسی مچھر کا منہ دیکھ کر اٹھا کہ روٹی کا ٹکڑا تو درکنار جان
بھی وبال جان ہو گئی ۔ بہتر آمادہ ہوتا تھا ۔ اور ہر چند ارادہ کرتا تھا کہ آگے

بڑھوں اور کچھ کہوں۔ مگر کچھ ایسا رعب چھایا کہ ایک قدم آگے نہ اٹھا۔ ہوا لمحہ لمحہ تیز ہو رہی تھی۔ اور پانی گز دو گز چھوڑ بلیوں اچھل رہا تھا۔ کالی گھٹا خالی نہ گئی اور موسلا دھار پانی پڑنا شروع ہوا۔ قدرت کا شکر ہے کہ اسی بہانے سے ملکہ کا سلسلۂ خیالات برہم ہوا۔ گھبرا کر اٹھی اور پلٹ پٹا کر پیچھے چلی۔ کشتی پہلے ہی سے ڈگمگا رہی تھی۔ دائیں طرف جھکنا تھا کہ پاؤں پھسلا اور دھڑام سے دریا میں۔ دُرّاج شناور پور کا رہنے والا اگر دنیا میں کوئی فن جانتا تھا تو تیراکی۔ فوراً کود گیا۔ ملکہ کو پشت پر لیا اور بحفاظت تمام کشتی میں لے آیا۔ سب اپنے اپنے کونوں میں بھوکے پیاسے دُبکے سکڑے بیٹھے تھے۔ اتنے بڑے واقعہ کی کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی

ہاں جان بچانے کے یہ دو ایسے زبردست احسان شاہین کی گردن پر ہوئے۔ کہ ہمیشہ کے واسطے ممنون ہو گئی۔ پوشاک تبدیل کی۔ کنارے پر آئی تو دُرّاج کو اپنے ساتھ چوراسیہ گاڑی پر بٹھایا اور اس طرح باتیں کرنے لگی:۔

شاہین: تم نے دو دفعہ میری جان بچائی۔ تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟"

دُرّاج: میں یہیں رہتا ہوں میرا گھر قریب ہے۔ اجازت ہو تو جاؤں"

شاہین: تو تم میرے ہمراہ محل تک نہیں چل سکتے؟"

دُرّاج: میری سب سے چھوٹی بچی جس کی ماں تیرہ روز کا چھوڑ کر مری اور اب ڈیڑھ برس کی ہے۔ مجھ سے بہت مانوس ہے۔ اس نے اتنی ہی دیر میں رو رو کر [illegible] کیا ہوگا۔ حکم ہو تو میں کل حاضر ہوں گا"

شاہین: تم نے ایک چھوڑ دو دفعہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر میری جان بچائی۔ یہ ایسا احسان ہے کہ میں اس کا معاوضہ نہیں کر سکتی۔ بالفعل یہ انگوٹھی قبول کرو۔ اور صبح کو دربار میں حاضر ہو"

دُرّاج: میں نے جو کچھ کیا وہ ہرگز احسان نہیں ہے۔ اور نہ اس غرض سے

کیا کہ شہزادی کی جان بچا کر مالا مال ہو جاؤں ۔ اس کا معاوضہ صرف اتنا چاہیئے کہ یہ جب سلام کو حاضر ہوں تو باریاب ہونے کی اجازت مل جایا کرے ۔

**شاہین** "صرف باریابی سے تمہارا پیٹ نہیں بھر سکتا ۔ تم نے ایسا کام کیا ہے کہ جب تک سلطنت زابلستان موجود ہے ۔ تمہارا نام باقی رہے گا تمہارے تعلقات خاندان شاہی کے ساتھ ہمیشہ یادگار رہینگے تخت زابلستان تمہاری وفاداری پر فخر کرے گا ۔ سلطنت تمہارا وظیفہ مقرر کرے گی ۔

**دُرّاج** میں ہرگز اس کا بھوکا نہیں ہوں مجھ کو صرف اتنی اجازت ملے کہ جب حاضر ہوں شرف ملاقات ہو جایا کرے ۔ یہ سب سے بڑا احسان ہے ۔

**شاہین** ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اس سے تمہارا کیا مطلب ہے ۔ تم شوق سے آؤ ۔ اور جب دل چاہے آؤ ۔ لیکن اس انگوٹھی کو منظور کر و ۔ جو میں ہاتھ سے تمہاری انگلی میں نہایت خلوص کے ساتھ پہناتی ہوں "

**دُرّاج** ۔ اس کی قیمت میری نگاہ میں اس لحاظ سے ہوگی ۔ کہ یہ آپ نے بطور مراحم خسروانہ مجھ کو عطا فرمائی "

اللہ اللہ حیات انسانی کا خوشنما منظر آنکھ کے سامنے ہے ۔ تاروں بھری رات سر پر ہے اور ماہِ کامل نے در و دیوار منور کر رکھے ہیں حسینانِ گل اندام شراب ناب ساغرِ بلوریں قدرت نے تمام سامان مہیا کر دیئے اے دل و جان سے زیادہ پیارے دوست کہاں ہو ۔ تمہاری صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں آؤ ۔ آؤ تھوڑی دیر مل بیٹھو ۔ ادھر آنکھ اُٹھا کر دیکھو ۔ یہ ہزارہا بندگانِ خدا اپنی تمناؤں کو آغوش میں لیے کیسی میٹھی نیند سو رہے ہیں ان کے پختہ سنگین مزارات کی ٹوٹی پھوٹی قبریں اپنے مٹنے والوں پر حسرت کے آنسو بہا رہی ہیں ۔ اور ہوا کے خوشگوار جھونکے ان مٹی کے ڈھیروں پر جھاڑو دے رہے ہیں ۔ اے جیتے جاگتے پیارو ! زندہ عزیزو ۔ دیکھو وقت فرصت اور بسا غنیمت ہے تیغ راہ کی

بوجھا اُڑ جان کے ساتھ ہے۔ روؤگے اور پچھتاؤگے۔ مگر یہ وقت نہ پاؤگے۔ دیکھو چاند مدھم ہوا۔ چاندنی پھیکی پڑی۔ تارے جھلملا گئے۔ ساغر لبریز ٹوٹ گئے۔ اور وہ حسن کی دیبیاں چھوٹ گئیں۔ قافلہ والوں نے اپنا اپنا رستہ لیا۔ اور بلبل خوش الحان صبح کا پیغام لے آئی۔ آہ کیسی اچھی رات تھی۔ مگر بات کرنے میں ختم ہوگئی۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ سماں درہم برہم ہوگیا۔

اے آبادی کو چھوڑ کر جنگل بسانے والو! اے نونہالو اور پیری جمالو! سوؤ، سوؤ پیٹ بھر کر سوؤ، خوش نصیب تھے۔ تم کہ انقلابات کے چکر سے چھوٹے! گھر برباد کیے۔ اور یہ بستی آباد کی!

"دنیائے ناپائیدار کے دام تزویر میں پھنسنے والو! تجسس کی آنکھیں کھولو اور تماشا گاہ عالم کی نیرنگیوں پر نظر ڈالو! زمانہ اُڑا چلا جا رہا ہے۔ اور عمریں ختم ہو رہی ہیں غنیمت ہے وہ وقت جو اطمینان سے گزر گیا۔ کشتی عمر معمولی رفتار سے بہہ رہی ہے اور انقلاب کی لہریں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔

کیسا مبارک وقت ہے ملکہ شاہین اپنی چھنگلی سے انگوٹھی اُتار کر دُرّاج کی انگلی میں پہنا رہی ہے۔ دُرّاج حسرت آمیز نظر سے شاہین کے چہرے کو دیکھ رہا ہے۔ انگوٹھی پہن چکا۔ تو کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

"ملکہ! کس مُنہ سے شکریہ ادا کروں"

ملکہ "اب تم جاؤ۔ صبح کو دربردولت پر حاضر ہونا۔"

گاڑی ٹھہری دُرّاج اُترا اور سلام کر کے رخصت ہوا"

# دربار شاہین

دُرّاج کی دوسری جان نثاری کا علم شاہین تک محدود رہا مگر پہلا معرکہ تو ایسا علی الاعلان تھا کہ ایران کا بچہ بچہ اُس کی شجاعت کا لوہا مان گیا۔ یہ بڑے بڑوں کے نمک خوار اور بڑے بڑے پہلوان سب دھڑے کے دھڑے ہی رہے اور ایک سے اتنا نہ ہوا کہ وقت پر کام آتا۔ شاہین لاکھ بُری آدمی سہی مگر احسان فراموش نہ تھی۔ سوچتی تھی کہ اگر زر و جواہر سے بھی تول دوں۔ تو اس کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ آدھی رات تک اسی چکر میں پڑی رہی۔ سینکڑوں تدبیریں اور ہزاروں منصوبے سوچ ڈالے جس عورت نے کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دی ہو اُس پر ایک چھوکرے کا احسان اور وہ بھی ایسے زبردست اس پر طرہ یہ کہ پالا پڑا تو ایسے شخص سے جو دل کا غنی نیت کا شیر ہاتھ کا سچا بات کا پکا صورت خوبصورت سیرت کا دلدادہ اور شاہ سے کوسوں دور۔ وضع داری میں چکنا چور چھلکا ہوا ہو تو کیونکر! کہتی تھی کہ عجیب قسم کا آدمی ہے۔ وظیفے کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھر گیا۔ روپے سے بیزار۔ انگوٹھی سے انکار۔ بیٹھنے سے وحشت۔ ساتھ چلنے سے نفرت۔ ایسے شخص کا احسان تقدیر میں لکھا تھا۔ دیکھا نہ سنا بھوکا ہوتا پیٹ بھرتی ننگا ہوتا بدن ڈھانکتی۔ مال و دولت کا طالب ہوتا تو سر سے امیر کرتی۔ جاہ و حشمت کا طلب گار ہوتا تو زیر سلطنت بناتی۔ یہ کیسا شخص ہے؟ ہے سب کچھ۔ چاہتا کچھ نہیں۔ دل کو کس کو اور کیسے دل کو کیا! آدمی کیا فرشتہ ہے۔ واسطہ نہ غرض۔ جان نہ پہچان۔ خدا واسطے جان پر کھیل گیا۔ سینکڑوں ہی انسان دیکھے اور سُنے ہوتے اور ہوں گے۔ مگر ایسا شخص تو وہم اور گمان میں بھی نہ تھا۔ کچھ نہ ہونے پر تو یہ کچھ ہے کچھ ہوتا تو کیا کچھ ہوتا۔ یہ ہر سو لطف قرنوں کے نمک خوار جن کو جان نثاری کے بڑے بڑے دعوے

تھے عمر بھر مفت کی روٹیاں توڑیں اور ایک بھی کام کا نہ نکلا۔ سب نمک حرام اور ایک سے ایک بدتر۔ عقل کام نہیں کرتی۔ کیا کروں کیا نہ کروں؟ مگر اس میں کلام نہیں مال و دولت کیا اگر سلطنت بھی بخش دوں اور وظیفہ و خلعت کیا اگر ریاست و حکومت بھی منظور کرلے تو احسان کا معاوضہ تو ہوتا نہیں۔

رات کا بڑا حصہ اسی ادھیڑ بن میں گزرا۔ اور علی الصباح شہباز خاں وزیر اعظم حکم شاہی ہاتھ میں جواسیہ گاڑی ساتھ میں دراج کے دروازے پر حاضر ہوا۔ دراج غریب اس گھڑی کو نہ پاتا تھا جب جشن دیکھنے کا ارادہ کیا۔ شاہین کے الطاف خسروانہ رسم تمیوری میں ساتھ لے جانا۔ گاڑی میں پاس بٹھانا۔ یہ وہی وار ایسے کاری تھے جن کی تلافی اس کے بس کی نہ تھی۔ اس پر انگوٹھی کا نشتر ایسا کاری زخم لگا جس نے ساری شیخی کرکری کر دی۔

دراج سا سادہ لوح اور ہاتھ ملانے کا زبردست جبر کا جب تک ملک آنکھ کے سامنے رہی بہت کچھ سنبھلا رہا۔ مگر او جھل ہونا تھا کہ وہ سفاکی اور بے باکی سب رخصت ہوئی۔ گاڑی سے اترا تو دل کا نشہ ہی مالک تھا۔ بھوک پیاس گئی گزری۔ کسل و تکان ندارد۔ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ چشم زدن میں وہ سہارا بھی گیا۔ اور گاڑی آناً فاناً یہ جا وہ جا۔ حسین عورت شباب کا زمانہ۔ کانوں میں الماس گلے میں مالا۔ صورت کی افضل سیرت کی اعلیٰ۔ ہاتھوں میں ہیرے پاؤں میں لعل۔ محبوبانہ انداز مستانہ چال حسن میں مست جوانی میں چور۔ دراج کو تو شاہین سچ مچ کی حور تھی۔

دل تو صورت دیکھتے ہی نذر ہو چکا تھا۔ رہے سہے ہوش حواس انگوٹھی کی بھینٹ چڑھے۔ کیسا کھانا دانہ اور کیسی بھوک پیاس۔ شاہین کے پاس سے اٹھنا تھا کہ کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ گھر کی طرف مڑا تو دل کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ قدم رکھتا کہیں تھا پڑتا کہیں منہ سے کہتا کچھ تھا نکلتا کچھ۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچا تو لڑکی نے ایک آفت مچا رکھی تھی۔

بہن ماں کی بچی۔ ڈیڑھ برس کی جان۔ مگر اُس اتنی سی فتنی نے گھر بھر کو ہلکان کر دیا۔ دن کے دس بجے سے جو چلانا شروع کیا تو چھ گھڑی رات کی توپ چل گئی اور اُس کی چیخم دھاڑ نہ تھمی۔ جھولے میں لٹا کر جھوٹے دیئے۔ گود میں لٹا کر لوری دی۔ مگر کیا مجال جو ذرا تالو سے زبان لگی ہو جس دن سے ماں مری کھانا پینا اُٹھنا بیٹھنا جو کچھ تھا۔ باپ کے ساتھ اور باپ کے ہاتھ رہا۔ ماں تھی تو وہ اور باپ تھا تو وہ۔ کیسی ہی بلکتی ہو جہاں گود میں لیا اور کندھے لگا کر ٹہلا جھٹ نیند آئی۔ پوری طرح پاؤں پاؤں بھی تو نہ چل سکتی تھی۔ مگر دم بھر کو بھی ذرا اِدھر اُدھر ہوتا تو وہ گھسٹتی گھسٹاتی لڑھکتی پڑھکتی ڈیوڑھی میں جا بیٹھتی اور بابا کہہ کر پکارتی۔ اُس کی آواز سُنی اور تالیاں بجا بجا کر نہال ہوئی۔ آج بھی کچھ دیر تک تو بیا بیا کہہ کر خوب تماشا کرتی رہی۔ اور پھر تو آخر دراج ہی کی بیٹی تھی۔ مزاج تھا کہ گھڑی تولہ اور گھڑی ماشہ۔

آغا قندھاری بیچاری پہلے ہی اپنی بیماری میں گرفتار تھی۔ ذرا سی کی آواز نکلی اور اُس کے کان سے پار ہوئی۔ پوتی کا بلکنا اور مرے کو مارے شاہ مدار۔ مگر کیا کرتی اور کہاں جاتی۔ دن بھر گود میں لیے ٹہلتی رہی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو سینکڑوں ہی پھیرے دروازے کے کر ڈالے ہوں گے۔ دالان انگنائی ایک کر دیا۔ مگر وہ چنچل ہی قابو میں نہ آئی۔ دراج غریب کی خود جان پر بنی ہوئی تھی۔ کس کی ماں اور کیسی بیٹی۔ کہیں آدھی رات کے قریب گرتا پڑتا گھر پہونچا تو اِدھر سے ماں بھبک کر آئی اُدھر سے بہن نے ٹانگ لی۔ لڑکی کی یا تو یہ کیفیت تھی کہ گھر بھر کو پریشان کر رکھا تھا۔ باپ کی آواز سنتے ہی جان آگئی۔ مرزا کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ چاروں طرف سے پوچھا پاچھ ہو رہی تھی اور گم سم کھڑا تھا۔ ماں کے بیسیوں کوسنے بہن کی سینکڑوں باتیں اُس کان سُنیں اور اِس کان اڑا دیں۔ اتنی بھی خبر نہ ہوئی کہ ماں بیٹیاں کہہ کس کو رہی ہیں۔ لڑکی کو لیے جیتے مرے پر ٹہلنے لگا۔ گود میں لڑکی خیال میں شاہین۔ لب پر دُعا اور دل میں آہیں!

بھڑاس نکل چکی تو ماں نے کھانا نکالا بہن نے پانی کی صراحی بھری اور بھائی کے پاس لاکر رکھی۔ بچی دن بھر کی تھکی ہاری سولہ سترہ گھنٹے کی بھوکی پیاسی پہلے تو خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی اور پھر اُدھر باپ کی گود اور پرے ملی لوری کندھے پر سر رکھتے ہی چپ ہو گئی۔ الگ سے لٹا دسترخوان پر آیا جوان آدمی ہٹا کٹا موٹا تازہ سیر آدھ سیر کچھ تو کھاتا۔ پہلا ہی نوالہ گولی بن کر رہ گیا۔ شاہین کی صورت دل میں ایسی کھبی کہ کھانا پینا سب بھلا دیا۔ سوچتا تھا اور ٹھیک سوچتا تھا کہ شاہین جیسی ملکہ اور میں۔ زربفت کو گاڑھا مخمل کو ٹاٹ چشم نہ دیکھا بور یا سُننے میں آئی کھاٹ کیسی حوریں اور کس کے غلمان یس شاہین کے آگے اللہ کا نام ہے۔ ہاتھ پاؤں۔ آنکھ ناک جو عضو ہے سانچے میں ڈھلا کانٹے میں تُلا صورت سیرت وضع قطع ایک سے ایک بہتر ایک سے ایک اعلیٰ کس سے کہوں اور کیا کہوں۔ جو سُنے گا وہ پاگل بنائے گا۔ اس کے اور نئے غلام بھی تو مجھ سے اچھے ہوں گے۔ اچھی جان بچائی کر اپنی ہی جان اجیرن ہو گئی کہیں جلد صبح ہو۔ پلا سے اور کچھ نہیں تو دُور سے دیکھ تو لوں گا۔

دسترخوان پر بیٹھا خیالی پلاؤ پکاتا رہا ماں بہنوں کو اس ادھیڑ بُن کی کیا خبر۔ وہ دو لوں کبھی کی پڑ کر ڈھیر ہوئیں۔ اُٹھا کھانا جوں کا توں چھینکے پر رکھ کر پلنگ پر آیا تو آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ پلک سے پلک جھپکانی حرام ہو گئی۔

تماشاگاہ قدرت کے مبصر چشم تامل سے دیکھ رہے ہیں کہ جسد خاکی کا عنصر خاکی قالب انسانی کے سانچے میں ڈھلا رنگ برنگ کے جلوے دکھا رہا ہے۔ زندگی کا چمن شاداب پیش نظر ہے۔ وسط چمن میں ایک خوشنما قطعہ ہے جس کے چاروں طرف یقین کامل کی مصفّا نہریں لہریں لے رہی ہے۔ اُمید کے خوش رنگ پھول کھل رہے ہیں۔ زمین گلہائے رنگین کی بچھاوٹ سے حسین عروس بن چکی ہے۔ بادِ مراد کے جھونکے چل رہے ہیں اور بادِ آرزو البیلا جھوم جھوم کر پانی کا مُنہ چوم رہی ہیں۔ طائران

ر نواسنج لہک لہک کر چہک رہے ہیں۔ اور گل اُمید کی پنکھڑیوں پر پروانہ وار نثار ہو رہے ہیں۔

سبزہ خوابیدہ پر یاس و نا اُمیدی کا جال پھیلا ہوا ہے اور انقلاب زمانہ کا صیاد تاک لگائے بیٹھا ہے۔ مگر یہ بھولی بھالی صورتیں نشۂ محبت میں چور ہشاش بشاش کلیلیں کرتی پھر رہی ہیں۔ ابر تول تول کر پھولوں پر گر رہی ہیں اور پانی میں ڈبکیاں لگا لگا کر پھر پھر اڑ رہی ہیں۔

مایوسی کے پھندے صاف نظر آ رہے ہیں۔ مگر اُمید کے بندے ایسے اندھے ہیں کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

آخر فلک کج رفتار نے صبح صادق کو زوال بنایا۔ اور رفتہ رفتہ آفتاب جہاں تاب نے بسیرے کی ٹھہرائی۔ کیٹرے رسے پھول جن کی مہکار کوسوں دور جا رہی تھی کہیں سے کہیں پہونچے۔

اب وہ تمام سماں درہم برہم ہوا قطعہ اُمید کا ٹوٹوں سے پٹا پڑا تھا جس پانی میں رنگ برنگ کی مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں خشک ہو چکا تھا کہیں کیچڑ کے ڈھیر تھے۔ کہیں دل ذل کے انبار جن کی نوسنجیاں کلیجوں کے پار ہو رہی تھیں۔ جال میں پھڑپھڑا رہے تھے اور حسرت ندامت سے سر دے دے ٹپکتے تھے۔

دراج گرفتار کو نیند تو کیا خاک آتی۔ لاکھ بن سنور کر لیٹا ہزار کروٹیں بدلیں بہتیرا چاہا ہر چند کوشش کی۔ مگر شاہین کا خیال ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ کسی عنوان تسکین نہ ہوتی تھی کبھی گل اُمید کی خوشنما پنکھڑیاں دل و دماغ کو معطر کر دیتی تھیں۔ اور کبھی یاس و نا اُمیدی زندگی سے بیزار کر دیتی تھی۔ لیٹا۔ بیٹھا۔ اٹھا۔ پھرا۔ زینہ کھول اوپر گیا۔ دروازہ کھول باہر آیا۔ چھت پر بیٹھ کر تارے گنے۔ کمرے میں بیٹھ کر گھڑیاں گنیں۔ تڑپا لوٹا چیخا پیٹا۔ مسہری پر جا کر موذن کو جھانکا تکا۔ نیچے میں آکر

مُرغ کو گھورا جو نہ کرنا تھا وہ کیا اور جو نہ کیا تھا وہ کر ڈالا۔ مگر صبح نہ ہونی تھی اور نہ ہوئی۔ دل میں کہتا تھا کہ اگر کہیں ملکہ جھوٹوں اشارہ پاگئی تو زن بچہ کولھو میں پلوا دے گی۔ حلوہ خوردن روئے باید۔ کس مُنہ سے اظہار کروں۔ سب کیا کرایا خاک میں مل جائے گا۔ یہ جو کچھ عزت و قعت خاطر مدارات ہے کچھ بھی نہ رہے گا۔ اور بنی بنائی بات بگڑ جائے گی۔ مگر تڑپوں گا تو کہاں تک۔ اور نہ کہوں گا تو کب تک مروں یا جیوں کہنا تو پڑے ہی گا۔ کس قیامت کی رات ہے کہ صبح ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ سینکڑوں ہی صورتیں اچھی بُری گوری کالی آنکھ سے نکلیں۔ مگر خدا گواہ ہے اس آن بان کی عورت۔ ایمان کی بات تو یہ ہے۔ دنیا میں تو ہے نہیں آسمان پر ہو تو ہو۔ یہ کیسی آفت ہے۔ کہ حُسن میں بینظیر اور پھر والیِ سلطنت وہی کہاوت ہوگئی — کریلا اور نیم چڑھا۔ محتاج ہوتی۔ راج کرواتا۔ حاجتمند ہوتی چوری کرتا ڈاکہ ڈالتا سر آنکھوں پر بٹھاتا۔ مگر کہاں میں کہاں وہ۔ گھر میں نہیں دانے بڑھیا چلی بھنانے۔ یہ بیل تو منڈھے چڑھتی نہیں۔ اچھا عذاب پیچھے لگا۔ جھونپڑوں کا رہنا محلوں کے خواب۔ روٹی تو پیٹ بھر کر نصیب نہیں۔ شہزادی کا عشق ہوا۔ زندگی ختم ہونی تھی ہوگئی۔

شب سیاہ نے آسمان کو کروٹ دی اور درّاج کے اس خبط پر صبح صادق کھلکھلا کر ہنسی۔ نماز پڑھنے کا اتفاق تو شاید عمر بھر نہ ہوا ہو۔ مگر اذان کی آواز کان میں آتے ہی جان میں جان آگئی۔ باہر آیا تو وزیر اعظم سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ طلبی کا پیغام زبانی سن کے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ درّاج جیسا فقیر اور دربار دل میں وزیر خوشی کے مارے باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ مُنہ پر دو چار چھپکے مار کر کپڑے بدل بدلا چلنے لگا۔ تو لڑکی بابا بابا کہتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ مگر وہ بچی کو روتا ماں بہنوں کو سوتا چھوڑ چھاڑ گاڑی میں بیٹھ دربار میں

جا حاضر ہوا۔

دربار کا کوئی خاص اہتمام نہیں دربار عام نہیں۔ خاص دربار وہ بھی بضرورت چند معزز عہدہ دار اور اہل کار دائیں بائیں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور بیچ میں ملکہ شاہین تخت شاہی پر جلوہ گر تھی۔ دُرّاج کا داخل ہونا تھا کہ ملکہ اور ملکہ کے ساتھ ہی تمام دربار استقبال کو اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہزادی کی اس عنایت پر لوگوں کو تعجب ہوا ہو خواہ حسد مگر سب دم بخود کھڑے تھے۔ دُرّاج سے بھی کو اتنی امید بھی نہیں۔ مگر خدا جانے کسی نے پڑھا سکھا کر بھیجا یا عشق نے یہ آداب سکھا دئے مجرا کیا زمین بوس ہوا۔ اور پھر نگاہ اُٹھا کر دیکھتا ہے تو وہ دھانی جوڑا اسم ڈھا رہا تھا۔ ارکین دربار کو دُرّاج کی یہ حرکت ضرور ناگوار ہوئی اور بعض تاڑنے والے تاڑ بھی گئے۔ مگر روک ٹوک تو در کنار کسی کی اتنی ہمت بھی نہ پڑی کہ نیچی سے اونچی نگاہ کر لیتا۔ سلام کر کے ٹھٹکا تو ملکہ نے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ آگے بڑھا اور دعائیں دیتا ہوا جا بیٹھا۔ کشتی زرنگار میں خلعت ہفت پارچہ پہلے ہی سے رکھا تھا پیش کیا گیا۔ اور ایک بیش قیمت دو شالہ جس میں چاروں طرف ہیرے اور جواہر ٹنک رہے تھے۔ شاہین نے اپنے ہاتھ سے عطا کیا ضرورت نے سب باتیں سکھا دیں کھڑا ہوا۔ سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا اور شکریہ ادا کیا۔

دربار ختم ہوا اور درباری رخصت ہوئے۔ ملکہ گاڑی میں بیٹھ دُرّاج کو ساتھ لے کر محل میں آئی۔ کمرہ خاص میں بٹھانے کا حکم دیا۔ اور تھوڑی دیر بعد خود بھی آ پہونچی۔ دھانی کے بدلے اب زعفرانی جوڑا تھا اور تاج شاہی کے بجائے جواہرات سے لپی ہوئی چادر زلف سرکش سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔

دل تو گرفتار کی اُمنگیں شاہین جیسی ملکہ آنکھ کے سامنے اور تنہائی کا عالم غریب دُرّاج کا خدا ہی نگہبان تھا منہ میں زبان نہ تھی۔ بدن میں جان نہ تھی تصویر کی طرح

گم سُم بیٹھا تھا۔

شاہین لاکھ کم سن ہزار ناتجربہ کار سہی۔ مگر تھی تو شہزادی سینکڑوں آدمی روزانہ نگاہ سے نکلتے تھے۔ تاڑ تو کل ہی گئی تھی آج اچھی طرح سمجھ گئی۔ کہ میرے حُسن کا جادو دراج پر چل گیا۔ کچھ دیر تو اس اُمید پر چپکی بیٹھی رہی کہ یہ اب کچھ بولے۔ اب کچھ بولے۔ مگر جب دیکھا کہ اس کو سانپ ہی سونگھ گیا۔ لاکھ موقع تنہائی دوں لیکن کچھ رعب حُسن کچھ آداب شاہی۔ یہ اسی طرح گم سُم رہے گا تو مجبوراً خود ہی پیش قدمی کی۔ ایک تمکنت آمیز نظر جس نے غریب کا کلیجہ تک چھلنی کر دیا۔ دراج پر ڈالی اور مسکرا کر کہا "کچھ مُنہ سے بولو سر سے کھیلو تم تو بالکل ہی تصویر ہو گئے" آب رواں کی رنگی سی نقاب نے حسن کی آب و تاب کو دوبالا کر رکھا تھا۔ اس اوٹ نے اور بھی لوٹ پوٹ کر دیا۔ گہرا رنگ۔ کتابی چہرہ بڑی بڑی آنکھیں پتلے پتلے ہونٹ رنگ میں رلا حسنِ چہرہ پر نزاکت۔ آنکھوں میں جادو لبوں پر تبسم عقل ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہوتی۔ صبر و شکیب غارت شرم و حیا برباد۔ دلدادہ دراج اٹھا اور یہ کہتا ہوا پاؤں پر گر پڑا۔

"اے حسینہ میں تیرے دربار میں آ کر لٹ گیا"

تقاضائے انسانیت یہ تھا کہ شاہین ہاتھ سے سر اٹھا کر بات پوچھتی خلاف شان تھا۔ پاؤں پر گرنے ہی نہ دیتی۔ دلاسا تسلی تشفی تسکین۔ دل سے نہیں دکھاوا اور جی نہیں ظاہری دوپٹہ سے آنسو پونچھ دیتی تو کچھ شان کو بٹہ نہ لگ جاتا دراج کون بڑا رئیس تھا۔ ٹکے کا آدمی بھیڑ کی لات گھٹنوں تک اور نے سے انسان میں باغ باغ ہو جاتا۔ ملکہ تھی تو ہو۔ مہمان نوازی تو فرض تھا۔ دراج کو راضی کر دینا نہ کچھ بڑا کام تھا نہ کوئی عظیم الشان مہم۔ مگر خدا اس محبت کو غارت کرے۔ وہ احسان اور جان نثاری سب گئی گزری ہوئی مزے سے بیٹھی دیکھتی اور چین سے بیٹھی سنتی رہی کہیں پندرہ بیس منٹ کے بعد بولی تو یہ :-

"خیر صلاح! کہو کہو کیا معاملہ ہے؟"

دُرّاج: (سر اٹھا کر) "معاملہ تو صاف ہے۔ مگر انصاف کیجئے۔ سب سے بہتر فیصلہ تو یہ ہے کہ اُس باغی کی طرح مجھ کو بھی سولی کا حکم ہو۔"

شاہین: کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا مطلب ہے۔ نگاہ ملا کر بات کرو۔ ورنہ چشم زدن میں آنکھیں کھل جائیں گی۔ اس تنہائی میں جہاں لونڈی نہ ماما تو کہو نا کہ تم کیا سمجھ کر میرے پاؤں پر گرے۔ سوچا یہ ہوگا شہزادی ہے تو کیا ہے تو عورت ذات بھلا۔ پھسلا رنگ پہ لے آؤں گا۔ بولو بولو! کہتے ہو کہو نہیں ایسا مزہ چکھاؤں گی۔ کہ چھٹی کا لکھا یاد آجائے گا۔ ڈرو مت جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔ خدا معلوم جان رہے یا جائے۔ اور پھر کہنے کا وقت آئے یا نہ آئے۔

دُرّاج: "یہ میں ہی منہ سے کہہ کر کیا نہال ہو جاؤں گا۔ میری صورت سوال ہے میں نے کہا میری حالت نے کہہ دیا۔ رہی جان اس کو میں پہلے ہی قربان کر چکا بسم اللہ کیجئے۔ ایسی موت تو خدا سب کو دے۔ مٹے تو چکا ہی مرنا باقی ہے۔ سو میں خود تیار ہوں یہ اور احسان ہوگا۔"

شاہین: کیسا احسان اور کس بات کا شکریہ عطا خلعت۔ نہ انوکھی چیز نہ نرالی بات دن رات ملتے رہتے ہیں۔ احسان تو تمہارا ہے کہ تم نے جان بچائی۔ زہے نصیب اس سلطنت کے جس میں تم جیسے جان نثار بستے ہوں اور دھن بھاگ اس والئ سلطنت کے جس کی رعیت میں ایسے ایسے وفادار موجود ہوں۔ مگر تمہاری اس حرکت کا سبب کیا ہے؟

دُرّاج: ملکۂ بلند اقبال! مجھ جیسا فقیر اور ان ہاتھوں سے دو شالہ! خدا کی شان یہ منہ اور یہ مسالہ! رونگٹا رونگٹا دعا دے تو شکریہ محال اور کنبہ بھر قربان ہو جائے تو مساوات ناممکن۔ البتہ ایک ارمان ہے:-

"سر آپ کے قدموں پہ ہو اور جان نکل جائے۔

"وفاداری شیوہ انسانیت اور جاں نثاری جوہر شرافت ہے۔ یہ ہی زابلستان جس میں رات بھر شیر اور ہاتھی دھاڑتے اور چنگھاڑتے رہتے تھے۔ آپ کے دم سے جنّت نشان بن گیا کون سا دن جاتا تھا کہ دس بیس فوجداریاں دو چار ڈکیتیاں سرِ راہ نہ ہوتی ہوں۔ اور کون سی رات گزرتی تھی کہ دس پانچ چوریاں ایک آدھ قتل سُننے میں نہ آئے۔ یہ آپ ہی کا اقبال ہے کہ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے ہیں چاروں دانگ میں انصاف کا ڈنکا بج رہا ہے۔ سڑک پر سونا اچھالتے چلے جاؤ کیا مجال جو کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھ لے جو ساری ساری رات کھٹکوں اور دھڑکوں میں گزار دیتے تھے چین سے میٹھی نیند سوتے ہیں محتاج یتیم رانڈیں دکھیاریاں جن کی عمریں فاقوں میں تیر ہوئیں۔ دونوں وقت مگن ہو کر ہزاروں دُعائیں دیتے ہیں۔ رحم دل شاہین منصف مزاج ملک بیمانے جو کچھ کیا میرا فرض تھا احسان نہ تھا۔

شاہین:۔ "اچھا تم اُٹھو اور میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

# مہمان نوازی

شاہین جواہرات میں لدی عطر میں ڈوبی پھولوں میں بسی خوشبو سے مہک رہی تھی سپید براق گلے میں جڑاؤ چمپا کلی ڈگڈگی کے پاس پچلڑا مالا کے ساتھ ست لڑا آٹھ انگل چوڑا گلوبند بیچ میں دو ہیرے۔ دمکتا ہوا سونا چمکتے ہوئے لعل چاندی سی صورت۔ بوٹا سا قد دُرّاج کو تو ایک ایک قدم اٹھانا بھاری تھا تھم تھم کر بڑھا بیٹھ بیٹھ کر اُٹھا گر گر کر سنبھلا اور سنبھل سنبھل کر چلا کمرۂ طعام میں پہونچے تو خدام دست بستہ موجود تھے۔ ہاتھ دھوئے دھلوائے اور کھانا کھانے ساتھ بیٹھے سونے چاندی کے برتن انواع اقسام کے کھانے۔ ایرانی پلاؤ شیرازی متنجن اصفہانی قورمہ اور خراسانی کباب دُرّاج نے تو شاید خواب میں بھی یہ سامان نہ دیکھے ہوں گے۔ دسترخوان دیکھتے ہی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ شاہین کی میزبانی ضرور قابلِ شکریہ ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ مہمان بدنصیب کی خود ہی جان پر بنی ہوئی تھی۔ چولھے میں گیا کھانا اور بھاڑ میں گیا کھلانا بار بار اصرار سے ایک نوالہ مُنہ میں ڈالا مگر کہاں جاتا اور کس طرح اُترتا۔ آخر با اقبال شہزادی نے اپنے ہاتھ سے شیرمال کا ایک ٹکڑا توڑ کر پیش کیا اور کہا۔

"ایسے گھٹے کہ کھانا بھی بھول گئے"

آنکھوں سے لگا کر شکریہ ادا کیا اور جس طرح ہوا دو چار لقمے زبردستی حلق سے اُتار کھانے سے فراغت پا کر ایک اور کمرے میں آئے۔ یہاں دیوار پر ایک تصویر تھی جس میں شہزادہ زرنگار اپنی محبوبہ کے پاس بیٹھا بصد حسرت و یاس اُسکے چہرے کو تک رہا تھا۔

شاہین: "جانتے ہو یہ تصویر کس کی ہے؟

دُرّاج: مجھے اپنا ہی ہوش نہیں تصویر کا پہچاننا تو بڑا کام ہے۔ مجھے تو صرف اتنی خبر ہے۔

از آتشم ز عشق شرارے بدروں نہ جست
ہنگامہ کہ سوختیم وچہ مردانہ سوختیم

شاہین "ماشاء اللہ چند ہی گھنٹوں میں مرحلے طے ہو گئے کس کا عشق ہے؟"

زبان نے جہاں تک یاری دی جس قدر ہمت دلائی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا مگر جہاں حرفِ مطلب تک پہنچا آپ تھم، زبان بند۔ سوچتا تھا کہ اگر دل کڑا کر کے کہہ بھی دوں تو شہزادی ہے اور سچ مچ کی شہزادی صاحبِ سلطنت والیٔ حکومت زبان ہلانے کی دیر ہے ایسا کھوج کھوئے گی کہ نشان تک نہ رہے گا۔ مجبوراً یہی کہتے بن پڑی کیا بتاؤں ملکہ میری صورت سوال ہے۔

شاہین "میں تو ایسی جا تمہ نہیں ہوں کہ اڑتی چڑیا کو پہچان لوں۔ بولو تم نہیں بتاؤ تم نہیں سمجھوں کیا خاک۔ یوں تو ماشاء اللہ زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ حال بیان کرنے میں صورت سوال ہو گئی۔ اچھا اب آپ تشریف لے جائیے مجھ کو کچھ کاغذ دیکھنے ہیں۔"

دراج "اب کب حاضر ہوں۔"

شاہین "جب آپ کو فرصت ہو اور جی چاہے۔"

دراج "میرا جی اب ہی کب اٹھنے کو چاہتا ہے۔"

شاہین "بس تم بیٹھے رہو میں جاتی ہوں۔"

دراج "اب اس طرح تو ہر جگہ بیٹھ سکتا ہوں یہیں کیا خصوصیت رہی۔"

شاہین "کل شام کو آنا۔"

دراج "خدا حافظ۔"

شاہین "اچھا!"

# غسلِ شیر

دروغ برگردنِ راوی سردار عبدالرحمٰن عثمانی کا بیان ہے کہ ایک دو نہیں اکٹھے چھ ساڑھے چھ مہینے ایسے گزرے کہ دُرّاج دن رات میں تین تین چار چار پھیرے کرتا اور شاہین اس سے بلا تکلف ملاقات کرتی۔ مہینہ بیس روز تو آشنائی رہا کہ کچھ دنیا کا خوف کچھ لوگوں کی شرم آبرو کا لحاظ عزت کا پاس دن کو برائے نام شستہ پر نقاب ڈال لیتی۔ اور پھر تو طبیعت کو موا لگا اور آپ ٹھہری شہزادی نہ کوئی کہنے والا۔ روکنے والا نہ ٹوکنے والا۔ وہ جھجک اور شرم سب گئی گزری ہوئی کھلم کھلا ملتی اور ہانکے پکارے بلواتی۔ ذرا دُرّاج کے آنے میں دیر ہوئی اور اس نے آدمیوں کی ڈاک بٹھا دی۔ ارکانِ سلطنت دیکھتے اور چپ ہو رہتے کس کی مجال تھی کہ دم مار سکتا۔ آدھی رات کا وقت جاڑے کا موسم۔ کوچوان غریب گاڑی پر بیٹھا سوں سوں کر رہا ہے اور اُف نہیں کر سکتا پھر یہی نہیں کہ کبھی کبھار بلکہ روزمرہ اور بلا ناغہ۔ نوکر پریشان مامائیں حیران ایک دن کی مصیبت ہو تو بھگت لی جائے۔ روز کی آفت، اور ہر وقت کی دِقّت۔ رات کے بارہ بج گئے۔ کھانا رکھا رکھا سخ ہو گیا جو ہے وہ مجبور اور معذور آپس میں سرگوشیاں کرتے اور دُرّاج کی جان کو دعائیں دیتے۔ وہی شاہین جس کے گرد خواب میں پرندہ پر نہ مار سکتا تھا رات رات بھر دُرّاج کے ساتھ قہقہے مارتی۔ ضروری کاغذ پڑے جھک مارتے اہلکار بیٹھے بیٹھے شل ہو جاتے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی حکم احکام بند۔ مقدمات چوپٹ۔ غرض چار ہی دن میں کچھ کا کچھ ہو گیا جس کا انصاف عدلِ نوشیروانی کہلاتا تھا مہینوں تختِ عدالت پر بیٹھنے کا نام نہ لیتی۔

شہباز خان وزیرِ اعظم شاہین کے دادا کے زمانہ کا آدمی بڑھا پھونس۔ شاہین جیسی سینکڑوں ناتھنوں میں بھری پڑی تھیں۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ شروع ہی میں

کھٹک گیا تھا۔ مگر جو دل کی بات گھٹنوں میں سر دیے اور دل دبے چپکا بیٹھا سارے سانگ دیکھتا اور اُف نہ کرتا۔ گو وہ زیرک تھا مگر ایسا نمک حلال تو کہ تو سلطنت زابلستان کو قیامت تک نصیب نہ ہوگا۔ شاہین اس کی گردن کی کھلائی سامنے کی پلی پالی بیٹیوں سے زیادہ سمجھتا تھا۔ اپنی ٹانگ کھولے اور آپ لاچار مرے خون کے سے گھونٹ پی کر چپکا ہو جاتا۔ دراج کا کام تمام کر دینا شہباز کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ شاہین دو چار روز رو دھو کر ٹھیک ہو جاتی۔ مگر سمجھدار آدمی زمانہ بھر کے ہوئے سینکڑوں رنگ دیکھے ہوئے سوچتا تھا کہ عورت اور پھر شہزادی تریا ہٹ اور راج ہٹ دو دو مصیبتوں کا سامنا ہے۔ خدا معلوم کیا اینڈا بینڈا حکم دے بیٹھے۔ سوچتے سوچتے یہ تدبیر سمجھ میں آئی کہ کسی طرح دراج کو شیشہ میں اتار دوں۔ دو چار دفعہ ایسا ہی ملا۔ ایک آدھ دفعہ عورت کی پھر رفتہ رفتہ وہ میل جول بڑھا کہ تمام زابلستان دنگ ہو گیا دراج سمجھ کا کورا عقل کا اندھا شہباز کے پھندے سے بچ کر کہاں جاتا۔ وہی باتوں میں بندہ بے دام ہو گیا۔ شاہین جیسی ملکہ طالب گاہ شہباز جیسا وزیر مددگار دراج سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا۔ جاڑا اور برسات آندھی آئے مینہ جائے مگر شہباز کی ملاقات تو بجائے شاہین کے پاس سے اٹھا اور سیدھا شہباز کے ہاں۔ پھر غضب یہ جگر کی وہ شادی جو ہوئی وہ بتا دی۔

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا چاہیے تھا کہ شاہین کے تمام راز ایک ایک کر کے شہباز کے قبضہ میں جا پہنچے۔ مان لیا کہ وزیر وفادار نمک حلال فرمانبردار جاں نثار سب ہی کچھ تھا مگر تھا تو غیر۔ دو میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا۔ اس بیچارے کو کیا خبر تھی کہ یہ میری عنایتیں اور مہربانیاں سیل کا سیل اور تل کا پہاڑ بن جائیں گی۔ خدا کو جان دینی ہے اور شاہین کا پیٹھ پیچھے علامہ ابن نصر جو اس واقعہ کا پہلا محقق اور زابلستان کا معتبر مورخ سمجھا گیا ہے لکھتا ہے:-

"گو ان تعلقات کا چرچا بچے بچے کی زبان پر تھا مگر تمام زابلستان چھان مارا۔ اور ایک شہادت بھی ایسی نہ ملی جس سے شاہین کے دامنِ عصمت پر کوئی دھبہ لگ سکتا۔"

محبت مروت عنایت شکایت سب سہی اس حد تک سے انکار نہیں کہ ایک دو دفعہ کیا دنوں اور مہینوں متواتر لگاتار اور پھر گھنٹوں اور پہروں دونوں بیٹھے باتیں کرتے۔ باتیں قہقہے بے تکلفی چھیڑ چھاڑ سب کچھ ہوتا اور دن دہاڑے ہوتا مگر اس کے آگے دونوں میں سے ایک کی ہمت نہ پڑی یہ اس مری ہوئی ماں کا فیضِ صحبت اور دودھ کا اثر تھا کہ شاہین ایسا خیال آتے ہی خوفِ خدا سے تھرا اٹھتی ورنہ کس کی ننگ و ناموس اور کیسی عفت و عصمت جو چاہا وہ کیا اور جو چاہتی وہ کرتی۔ بات صرف اتنی تھی کہ خود بینی اُس کے مزاج میں معمول سے زیادہ گھسی ہوئی تھی۔ اور اگر ہمارا خیال غلط نہیں تو یہی خود بینی معاوضۂ احسان کے ساتھ سمندِ ناز پر ایک تازیانہ تھا جس نے یہاں تک نوبت پہنچا دی۔ وہ سمجھتی تھی کہ جہاں اور طرح طرح کے جانور اور بن بن کے پکھیرو میرے دربار میں بولیاں بول رہے ہیں۔ وہاں ایک دراج بھی "سبحان تیری قدرت" کے نعرے لگا رہا ہے۔

دراج اپنی حالتِ زار کا اظہار کرتا وہ دل میں خوش ہوتی وہ روتا وہ ہنستی وہ ہائے ہائے کرتا وہ ہاہاہا کرتی۔ اس سے انکار نہیں کہ دراج کی محبت کا اس کی طبیعت پر ایک خاص اثر تھا جو رفتہ رفتہ خود بھی محبت کے ضمن میں داخل ہو گیا۔ مگر اس کو کیا معلوم تھا کہ یہ دراج پیٹ کا ہلکا کانوں کا کچا رتی رتی اور تل تل شہباز سے جا پرورے گا اور یہ گھر کا بھیدی ایک دن لنکا ڈھا دے گا۔

بقر عید کے دن مغرب کے بعد زابلستان کی مشہور رسم "غسلِ شمشیر" ادا ہو رہی تھی۔ سات قسم کی سات ہری ترکاریاں داہنی طرف رکھ کر وزیرِ اعظم نے شہزادی کے پاؤں پر دودھ کے چھینٹے دیئے اور ارکینِ سلطنت نے باری باری اٹھ کر پھول نچھاور کئے اور ترقیِ اقبال کی

دعائیں دیں۔ اب چھنگلی میں مہندی لگانے کا وقت تھا۔ سلطانہ باغ کی مہندی شاہین کے اپنے ہاتھ کی توڑی ہوئی عطر و گلاب سے گندھی سونے کی تھالی میں رکھی آگے آئی شہباز خاں کھڑے کا کھڑا ہی رہا اور دراج کو مہندی لگانے کا حکم عطا ہوا چھوٹے سے بڑے تک سب سناٹے میں دم بخود تھے۔ مہندی کی رسم ادا ہوئی۔ شاہین دراج کو ساتھ لے محل پہونچی کچھڑی تو پہلے پک رہی تھی مہندی کے رنگ نے سب کو دنگ کر دیا۔

شاہین کا کمرۂ خواب یوں ہی ماشاء اللہ ایسا تھا کہ قدم رکھتے ہی نیند آجائے۔ آج تو برس کا برس دن تھا مومی بتیاں کافوری شمعیں جھاڑ فانوس تمام کمرہ جگمگا رہا تھا۔ دراج کا کام تو مہندی ہی نے تمام کر دیا تھا۔ کمرے میں پہونچا تو حالت ہی کچھ اور تھی۔ ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور بے اختیار ہو کر کہنے لگا:۔

"اللہ کبھی میرا ارمان بھی پورا ہوگا"

شاہین: "معاوضہ ارمان؟

دراج: جان!"

شاہین: "لاحول ولا قوۃ"

دراج: "اس سے زیادہ قیمتی چیز اور میرے پاس کچھ نہیں۔"

شاہین: "تقدیر"

دراج۔ تقدیر کا پھیر تو تھا ہی جو ایسا ارمان دل میں پیدا ہوا"

شاہین۔ تو کیا تم اپنے تئیں بدنصیب آدمی خیال کرتے ہو"

دراج۔ ہرگز نہیں! مجھ سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہوگا۔ جو چاہا وہ ملا جو مانگا وہ لیا۔ آپ جیسی ملکہ اور مجھ پر کرم اور مکھیریں بدنصیب ہیں آپ سے بھی زیادہ خوش نصیب ہوں"

شاہین: تم کو معلوم ہے کہ میں کل رات کو دو مہینہ کے واسطے اصفہان جاتی ہوں۔

دراج: "تو جانے سے پہلے میرا انتظام فرما دیجئے۔ دو مہینہ کیا میں تو دو لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

شاہین ۔ اس قدر مبالغہ سے کیا حاصل ؟ "

دراج ۔ تقدیر جو جو کچھ دکھائے گی سب دیکھوں گا لیکن میں اس خیال سے ضرور خوش ہوں کہ انشاء اللہ بہت جلد قربان ہو جاؤں گا ۔ اور یہی عین آرزو ہے ۔ انصاف کیجیے جس شخص کا رات دن میں ایک گھنٹہ بھی ایسا نہ گزرتا تھا کہ خیال سے مفارقت کر سکے وہ دو مہینہ کا فراق کس طرح جھیل سکے گا "

شاہین ۔ خیال سے فراق کی تو اب بھی ضرورت نہیں "

دراج ۔ اب تو ہر وقت یہ تسکین ہے کہ جو کچھ گزرے گی جا کر سنا دوں گا جب تسکین بھی گئی گزری ہو پھر کیا اُمید باقی رہے "

شاہین ۔ دراج ! یہ سب ڈھکوسلے ہیں خیر ! میں تم کو یہ ایک رومال دیتی ہوں جو پانچ چھ پشت سے میرے خاندان میں نسلاً بعد نسلاً امانت چلا آتا ہے میری پرنانی رابعہ شانی نے اپنی ماں کی نشانی سمجھ کر میری ماں کو دیا ۔ جو میری مرحومہ ماں نے نکاح کے بعد میرے باپ کو عطا کیا اور پھر میرے پاس آیا ۔ اس کو بطور یادگار اپنے پاس رکھنا ۔ اگر کبھی میرا خیال آئے تو اس کو دیکھ لیا کرنا "

دراج " آہ ۔ ملکہ کیسی دل خراش گفتگو ہے ! اگر کبھی میرا خیال آئے ۔ کیا میری زندگی میں ایسا کوئی لمحہ بھی گزر سکتا ہے کہ آپ کا خیال مجھ کو نہ آئے "

شاہین ۔ اب تم جاؤ میں کچھ لکھوں گی ۔ آؤ ہاتھ ملا لو "

دراج ۔ دراتھ میں ہاتھ لے کر ) کس طرح شکریہ ادا کروں ۔ اس ہاتھ کو سر پر رکھوں آنکھوں سے لگاؤں "

شاہین " اچھا ! رخصت "

دراج " فی امان اللہ "

شاہین ۔ سلام "

# فراق اور دھوکہ

تارے چمکے اور چھپے۔ چاند گھٹا اور بڑھا۔ دن نکلے اور ڈھلے۔ راتیں آئیں اور گئیں۔ انتظامِ عالم کے تغیرات کیا جاڑا کیا برسات۔ کیا دن اور کیا رات ہوئے۔ اور کھلم کھلا ہوئے۔ راتیں پھر گئیں۔ موسم پلٹے۔ زمانہ بدلا۔ کلیاں پھول ہو ہو کر مرجھا گئیں۔ پھول کھل کھل کر کملائے۔ ہری بھری شاخیں سرسبز و شاداب ہو کر دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا اور سوکھی کھڑکھڑاتی ڈالیاں آناً فاناً میووں سے لد گئیں۔

کارخانۂ قدرت کا ہر ذرہ متحرک اور حیاتِ انسانی کا ہر حال متغیر مگر قیام تھا تو غریب دراج کی مصیبت میں۔ ہر چند کوشش کرتا کہ کسی طرح دلِ گم شدہ کو تسکین ہو لیکن شاہین کا فراق بلائے بے درماں۔ ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ چند ہی روز میں مُردوں کی سی صورت ہو گئی۔ دیوانہ وار ادھر ادھر پھرتا مضطرب و بیقرار ہر طرف جاتا۔ مگر خدا بھلا کرے جشنِ نوروز کا کچھ ایسی گھڑی کی آگ لگی کہ جتنا بجھاتا تھا اتنی ہی زیادہ بھڑکتی تھی۔ ماں بہنیں۔ دوست آشنا۔ عزیز و اقارب اپنی اپنی جگہ سب ہی نے سمجھایا۔ مگر کیسی درستی اور کس کی اصلاح۔ کہاں کی بہن اور کدھر کا بھائی۔ وہ اس کو ایسے تھے جیسے گائے کو قصائی۔ محل کے نیچے جاتا ٹھنڈے سانس بھرتا۔ جنگلوں کی سیر کرتا۔ میدانوں کی خاک اڑاتا۔ وحشیوں کی طرح رہتا۔ دیوانوں کی طرح پھرتا۔ ریگستان کا وحشت خیز جنگل۔ دوپہر کا سنسان وقت۔ نصف النہار کا سورج سر پر۔ بیابان کے زرد زرد پھول دائیں بائیں دریائے ماموں آنکھ کے سامنے ہوتا۔ اور شاہین کا شیدائی دیوانہ و سودائی دراج خانہ برباد اپنی محبوبہ کی یاد میں صبح کو دوپہر اور دوپہر کو شام کرتا! آخری مہینے کی اندھیری راتیں ان ہولناک دردوں میں بسر ہو جاتیں۔

جہاں نین دہاڑے جاتے کلیجے دہلتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن گھنٹہ آدھ گھنٹہ کو گھر جاتا تھوڑا بہت کھاپی جدھر منہ اٹھا چمپت ہوا۔ وہی دراج جو کبھی دو وقت پکا سیر بھر اناج اس طرح ٹھونستا تھا کہ بھورا تک نہ بچے۔ اب دو دو تین تین وقت کے بعد آدھ یا تین چھٹانک کھا لیتا ہو گا۔ وہ بھی کچھ عزیزوں کی زبردستی کچھ کبھی سلسلہ کا کہنا سننا۔ انجام یہ ہوا۔ کھانے سے کی لاپروائی، غم سے پڑا پالا تسکین ہوئی نہیں۔ طاقت تھی کہ دن بدن گھٹنے لگی سکت و توانائی رفو چکر کس بل غائب غلہ ہاتھی جیسا ڈیل سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ انگوٹھی پر نثار رومال پر قربان خیال پر فدا دو مہینے کا فراق قیامت کا سامنا تھا جس نے ہوش و حواس سب کھو دیئے۔

ایک دفعہ رات کے وقت کنارِ دریا پر بیٹھا شاہین کے خیال میں غرقاب تھا نگاہ آسمان پر جا پہنچی۔ چاند بدر ہو چکا تھا۔ تارے ٹوٹ ٹوٹ کر جھڑ رہے تھے۔ کچھ دیر تک دیکھتا رہا اور پھر بے ساختہ چلا اٹھا۔

"ہاں ہاں! ساتھ سہیلی کے جھمکے نکل نکل چھپ چھپ کے نکل اور ماند ہو ہو کے چمک۔ مگر شاہین کی صورت نہ دکھا اُوہ" ابھی یہ الفاظ ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک سانڈنی سوار روشنی ہاتھ میں لئے قریب آیا اور کہا:۔

"مرزا صاحب! میں صبح سے تلاش کر رہا ہوں یہ ملکہ بلند اقبال کا خط ہے"

سانڈنی سوار خط دے کر رخصت ہوا۔ رات کا پچھلا پہر اندھیرا گھپ چاروں طرف خیال دوڑایا۔ مگر شہباز خاں کے سوا کوئی اور ایسا سمجھ میں نہ آیا جو اس راز میں شریک ہوتا۔ نہال نہال بشاش بشاش اچھلتا کودتا ڈیرہ پہونچا۔ شہباز خاں ایک چلتا ہوا آدمی تھا چوروں کا بادشاہ۔ مکاروں کا پیر۔ اُس نے پہلے اصلی خط جو طلبی کا تھا غائب کر دیا اور اس مضمون کا فرضی خط کہ

"میں آج کے چوتھے روز زابلستان آتی ہوں" دراج کو پہنچوا دیا۔

خط کھولا پڑھا خوشی کے مارے اُچھلنے لگا۔ شاہین کے خط کا یقین ایک ایسی زبردست تسکین تھی جس نے اُس تمام رنج و الم کو فرحت و انبساط سے بدل دیا۔ جان میں جان آگئی کبھی سر پر رکھتا کبھی آنکھوں سے لگاتا کھولتا۔ بند کرتا رکھتا اُٹھاتا۔ خدا معلوم اس کاغذ کے پرزہ میں کیا جادو تھا کہ وہ افسردگی اور خمخشی سب جاتی رہی۔ آمد کا انتظار اُمید دیدار۔ اشتیاق ملاقات۔ چار دن اور چار رات کاٹنے قیامت تھے۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک سال زندگی اجیرن جان وبال غرض خدا خدا کر کے تین دن گزرے۔

شہباز خاں وزیر اعظم شروع ہی سے تاک میں تھا موقعہ کو غنیمت اور فرصت کو نعمت سمجھ ویسی ہی انگوٹھی اُس ہی جیسا رومال تیار کرا کر چپ چاپ ہو بیٹھا۔

چوتھے روز صبح کے وقت دراج انگلی میں انگوٹھی ہاتھ میں رومال شہباز کے جال میں پھنسا بیٹھا تھا کہ ایک خادم نے آکر کہا "پانی تیار ہے"

شہباز۔ مرزا صاحب۔ اب آپ غسل فرما کر پوشاک تبدیل کیجئے۔ انگشتری اور رومال میرے پاس رکھ جائیے۔

شہباز عیار فیلسوف۔ دراج گیگلا مسکین بیوقوف۔ زبردست کمزور کا مقابلہ کیا شہباز اور دراج کی جوڑ کیسی۔ وہ باتوں کا مہمان۔ وہ چلکیوں کا محتاج۔ دراج بیچارے کی ہستی ہی کیا تھی۔ بڑے بڑے مدبر اور اچھے اچھے دور اندیش شہباز کے آگے کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ دراج تو کس گنتی میں تھا آغا کا لال باندھ پر چڑھا انگوٹھی اور رومال دونوں بدلوا بیٹھا۔

دوپہر ہوئی شام ہوئی کیسی گاڑی کس کا گھوڑا۔ کہاں کی ملکہ۔ کدھر کی شاہین۔ سواری نہ شکاری۔ وہ تو شہباز کا حاشیہ تھا جس کی دراج کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ وہ اُس تحریر کا نوشتہ تقدیر سمجھ رہا تھا۔ ساری رات محل کے نیچے اس امید پر گزاری شہزادی اب آئے اب آئے۔

عقل کا اندھا۔ یہ سمجھا زابلستان کی مالک اتنی بڑی سلطنت کی شہزادی لاکھ چھپ چھپاتے آئے فوج نہیں۔ ہمراہی، ہمراہی نہیں اردلی اردلی نہیں۔ نوکر سو پچاس دس بیس کچھ تو ہوں گے۔ صبح ہوئی تو جلا بھنا چیں بہ جبیں کھسیانی صورت روتی صورت شہباز کے پاس پہونچا۔ تقدیر سے صلاح کار بھی ملا تو ایسا کہ اُس نے ایک ہی وار میں تسمہ بھی نہ لگا رکھا۔ ظاہر تو ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور اندر خانے درّاج کا اُٹھ کر جانا تھا۔ دس آدمی ہمراہ انگوٹھی اور مال قبضہ میں کر معمولی سامان ساتھ لے اصفہان جا دھمکا۔ شاہین کیسی ہی ہوشیار کتنی ہی سمجھ دار لاکھ دور اندیش ہزار منتظم و سلیقہ شعار سہی تھی۔ مگر تھی تو عورت اور اگر نہ بھی ہوتی تو شیطان نہیں فرشتہ نہیں ولی نہیں خدا نہیں اس کو ان تیر تیروں کی کیا خبر کہ یہ بڈھا چنڈال بھیس میں جنگی ڈال چکا اور دو گھڑی کی شکل کو اصل کر رہا ہے۔ سیدھے سبھاؤ درّاج کا حال پوچھنے بیٹھ گئی۔

شہباز (شہزادی)۔ وہ زابلستان کا مشہور بدچلن اوباش چھٹا ہوا بدمعاش۔ آپ نے پیٹھ پھیری اُس نے ایک شکار چھانسا۔ جمعدار شیر افگن سے تو سرکار واقف ہیں۔ دن رات اُس کی سالی کے ہاں پڑا رہتا ہے۔ سنتا ہوں نکاح بھی ہو گیا۔ اس نمک حرام نے جو جو کچھ مشہور کیا میری تو زبان بھی نہیں اُلٹ سکتی۔ سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا اُبل گئی۔ آپ نے تو معاوضہ احسان کیا وہ سمجھا ملکہ کی نیت ہی کچھ اور ہے۔ بھلا وہ ذلیل شرافت سے کورا مزاج کا چھچھورا آپ کی عنایتوں کے قابل تھا۔ اس کمبخت کی وجہ سے تو تمام شہر میں ڈھنڈورا پٹ رہا ہے اور بستی بھر میں ناک کٹ رہی ہے۔ ایسا شخص تو صورت دیکھنے کے قابل نہیں (انگوٹھی اور رومال آگے ڈال کر) یہ عطیہ شاہی اور جمعدار کی سالی جیسی واہی تباہی عورت گستاخی معاف آپ نے بھی کمال کیا ایک معمولی آدمی کو یہ کچھ اعزاز بخشا۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھی۔ وہ تو جو کچھ نہ کرتا۔ وہ تھوڑا وظیفہ تنخواہ سالانہ ماہانہ جو جی چاہتا مقرر

زماتیں یہ اور کی کیا اچھی لگائی۔ باپ دادا کی عزت بڑوں کی لاج سب دراج کی نذر ہو گئی۔ بچے سے لے کر بڑھے تک کیا مرد اور کیا عورت جدھر جاؤ یہ ہی تذکرہ اور جہاں دیکھو یہ ہی چرچا سنتے سنتے کان تھک گئے اور دیکھتے دیکھتے کلیجہ پک گیا۔

شہباز اپنا دام تزویر بچھائے کھڑا تقریر کر رہا تھا اور شاہین کی یہ کیفیت کہ ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ انگوٹھی رومال دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئی۔ شہباز جھوٹا تھا خواہ سچا مگر دراج سامنے ہوتا تو وہ کچا کھا جاتی۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اصفہان کا ایک ایک لمحہ وبال ہو گیا کہتی تھی کہ کسی طرح پر لگ جائیں اڑ کر پہنچوں اور اس نابکار کا سر اڑا کر کلیجہ ٹھنڈا کروں منتظر تھی۔ اس کے آنے کی یہاں جو دیکھا تو معاملہ ہی الٹ پلٹ کہاں کی تعمیل اور کس کا آنا رنگ ہی دوسرا تھا تلووں سے جو لگی تو سر تک پہنچی آؤ دیکھا نہ تاؤ سب جھگڑے چھوڑ چھاڑ وزیر کو ساتھ لے جھٹ پٹ زابلستان روانہ ہو گئی۔

# مرضِ متعدّی

شہباز کی روانگی لاکھ پوشیدہ ہو مگر اتنا بڑا آدمی وزیر سلطنت ؛ جانے کی دیر تھی تمام شہر میں مشہور ہوگئی ۔ دراج کا ماتھا تو سنتے ہی ٹھنکا تھا۔ مگر سیدھا آدمی دِل آئینہ حسد نہ کینہ بات کا پورا قول کا سچّا بہتیری ہی عقل لڑائی لیکن نہ کوئی پہنچا انتظار کی حد صبر کی انتہا ایک آدھ روز تو بہت ہی سخت مصیبت میں رہا دیواروں سے ٹکریں ماریں پہاڑوں سر پھوڑے ۔ مگر خدا کی شان دیکھو کہ ڈھیں لکھاج مفلسی میں آٹا گیلا۔ ابھی وہ مصیبت ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک اور آفت کا سامنا ہوا۔

جمعہ کی صبح کو سیدھے ہاتھ میں سپید سپید ہلکے ہلکے دھبّے دکھائی دیئے۔ دیکھنے میں تو معمولی تھے ۔ مگر جلن اور کھولن کس غضب کی کہ الامان الحفیظ شام تک تو سارا ہاتھ سوج کر کپّا ہوگیا۔ رات کس مصیبت کی کٹی ہے ۔ کہ خدا دشمن کی بھی ایسی نہ کاٹے۔ صبح کو تو مرض کی حالت ہی کچھ اور تھی جسم بھر میں پھپھولے اور اس میں سوزش ہے۔ ادھر فراق کی چھریاں ادھر مرض کے نشتر مجبور معذور علاج کا قصد کیا۔ سلطنت کا طبیب حاذق اسفندیار کچھ دیر تک تو غور سے دیکھتا رہا اور پھر تو اس طور سے بھاگا۔ کہ سب متعجب ہوگئے ۔ دور جا کر کھڑا ہوا اور وہیں جا کر للکارا ۔

"بہتر ہوگا کہ آپ چلے جائیں ۔ یہ ایک ایسے مرض متعدی کی ابتدا ہے جس کا علاج خدا کے ہاں بھی نہیں مجھ کو اندیشہ ہے کہ آپ کی وجہ سے یہ بیماری تمام سلطنت میں نہ پھیل جائے جس کو آپ کی ہوا بھی لگے گی وہ اس آزار میں گرفتار ہوگا۔

دراج بدنصیب کے واسطے اس سے زیادہ مصیبت کا وقت اور کون سا ہوتا ؟ ۔

طبیب کے الفاظ نے ساری ہی امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر خدا کا شکر کیا اور کہنے لگا:۔

"آہ! خالق الموجودات ایک بھی ارمان پورا نہ ہوا۔

مرض کی تکلیف لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہو رہی تھی۔ مگر شاہین کا خیال دم بھر کو بھی پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ گو جسمانی تکالیف نے جان پہ بنا دی تھی لیکن روحانی تکالیف سے چہرے کا رنگ متغیر ہوا جاتا تھا۔ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔

"اب گل اندام شاہین کے قریب جانا ایسی محسنہ اور ایسی حسینہ کو جان بوجھ کر آزار لگانا تقاضائے محبت نہیں ہے۔"

# آمنا سامنا

شام کا وقت قریب تھا۔ درّاج حسرت نصیب تیرہ مردہ اور شکستہ حال لوگوں سے بچا سڑک کے کنارے چلا جا رہا تھا کہ شاہین کی سواری نظر آئی کیسا دردانگیز سماں تھا وہی درّاج جس کے دل میں ہزاروں ارمان بھرے تھے بصد حسرت و یاس شاہین کو دیکھنے لگا۔ درّاج کی صورت دیکھتے ہی شاہین کی آنکھوں میں خون اتر آیا حکم دیا۔

"فوراً محل پر حاضر ہو۔"

حسرت بھرا دل یہ حکم سن کر گم سُم رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے کلیجہ کسمسانے لگا مگر سچی محبت نے تعمیل کی اجازت نہ دی۔

شاہین آگ بگولہ محل میں پہونچی۔ جوں جوں درّاج کے آنے میں دیر ہو رہی تھی غصہ اور زیادہ بھڑک رہا تھا! جو آدمی گیا وہ واپس جو پیغام بھیجا وہ ناکام۔ بات دل میں بیٹھ ہی چکی تھی۔ دیر اور پھر دیر پر انکار حق الیقین ہو گیا جلتی بھنتی سانپ کی طرح سر دھنتی باہر آئی اور شہباز کو طلبی کے واسطے روانہ کیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اس سے بہتر موقعہ اور کون سا ملتا۔ اِدھر اُدھر پھر پھرا آن موجود ہوا اور کہنے لگا۔

"وہ اُسی جمعدار کے ہاں بیٹھا بکواس رہا تھا۔ مجھ سے بات بھی نہیں کی۔ اندر ہی سے کہہ دیا۔ ملنے کو جی چاہتا ہے۔ تو شہزادی خود کیوں نہیں آجاتی۔"

نمک حرام شہباز ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ آخر غریب درّاج کی جان لے کر چھوڑی اب کیا کسر رہ گئی۔ لال پیلی پہلے ہی ہو رہی تھی اتنا سنتے ہی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وزیر کو دیکھا اور حکم دیا:۔

"گرفتار کر لو اور علی الصباح سرِ بازار سولی دو۔"

# قتل

شہباز تو خدا سے چاہتے تھے۔ آرزو بھی تو یہ! اور ارمان تھا تو یہ۔ حکم سنتے ہی جان میں جان آ گئی۔ کوتوال کو ساتھ لے کر تین دن میں گرفتار کر کے جیل خانہ بھیج دیا۔ مگر شاہی ہوئی نہ تھا کہ چھپ جاتا۔ چھ گھڑی کی لپ چلنے تک تو بچہ بچہ کی زبان پر دراج کا چرچا تھا۔ صبح ہوتے ہی ادھر شہباز تھا، ایک طرف جنگی جوان دوسری طرف برق انداز دراج کو مقتل میں لے حاضر ہوا۔ ادھر شعبانہ دراج کی چھوٹی بچی ننگے پاؤں مقتل میں آئی۔ حسرت بھری نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک تو حیران پریشان چپ کھڑی رہی۔ پھر ضبط محبت سے بے قرار ہو کر چلا اٹھی۔

"بابا من نیز حاضر شدم"

بیٹی کی اس صدائے جگر خراش نے باپ پر ایک عجیب حالت طاری کر دی۔ گردن میں طوق تھا۔ بمشکل منہ پھیر کر دیکھا۔ دراج کی نگاہ کا پڑنا تھا کہ شعبانہ بے تابانہ آگے بڑھی۔ باپ کے پاؤں سے جا لپٹی اور منہ اٹھا کر اس کے چہرے کو تکنے لگی۔ زنجیر کا کانٹا جو ہاتھ میں پڑا تھا اپنے ہاتھ سے ہٹا کر پوچھنے لگی۔

"بابا! ایں چیست؟ چوڑی!"

معصوم بچی کی بھولی بھالی باتوں نے مظلوم باپ کے کلیجے کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ مشکیں بندھی ہوئی تھیں۔ نیچے بیٹھ گیا اور بچی کو چھاتی سے لگا لیا۔ محبت نے جوش کیا۔ آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ باپ کو روتا دیکھ شعبانہ چیخیں مارنے لگی۔

باپ بیٹی کی آخری ملاقات کا منظر کچھ ایسا مؤثر تھا کہ شہباز جیسا سنگ دل آدمی بھی دم بخود رہ گیا۔ طوق کے ساتھ ہی ساتھ ننھے ننھے ہاتھ باپ کی گردن میں

پڑے تھے محبت بھری نگاہوں سے چہرے کو تک رہی تھی۔ اور ننھا سا حسرت بھرا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا۔ چار پانچ برس کی بچی کی بساط ہی کیا۔ باپ چند لمحے کا مہمان تھا اور وہ پانچ برس کی جان کچھ ایسی باتیں ملکا رہی تھی کہ سب گم سم تھے۔ باپ کے منہ پر منہ رکھ دیا اور نہایت خوشامد سے کہنے لگی:-

"بیا! خانہ برویم!"

بیٹی کی یہ درخواست ایک تیر تھا جو باپ کے کلیجے کے پار ہو گیا۔ بیمار کیا تھکا ہارا سر ہاتھ پر پھیرا اور کہا:-

"شعبانہ! پدر را خدا حافظ بگو"

---

# خاتمہ

گرمی کا موسم صبح کا سہانا وقت۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مقتل زالبتان سے ملا ہوا ایلفاری قبرستان دُنیائے ناپائیدار کی بلند صدائیں لگا رہا تھا۔ سنگ مرمر کے سپید مزار حیات انسانی کی بے ثباتی کا پیش خیمہ تھے۔ کچی پکی قبروں کے بسانے والے جو اپنے گھر بار کو چھوڑ پیاروں سے مُنہ موڑ بے خبر سوتے تھے۔ جسد خاکی کے استقبال کو صف بستہ کھڑے دزراج بے گناہ کے عبرت ناک قتل کو چشم افسوس سے دیکھ رہے تھے۔ ان مٹ جانے والی صورتوں میں بہت سے ایسے تھے جو عمر بھر اپنی غرض کے بندے رہے۔ فاتحہ نہ درود جئے تو فضول۔ مرے تو مردود۔ تن پروری کو مقصد حیات سمجھ کر وقت پورا کر آئے۔ اور خود غرضی کو سب سے بہتر اصول سمجھ کر زندگی ختم کر دی! جسد ناپائدار کی جھوٹی سچی نشانیو! آج کوئی آشنا نہیں کہ تمہارے مٹی کے ڈھیروں پر دو پھول چڑھا دے۔ تمہارے ارادوں کے ساتھ تمہارے نام مٹ چکے اور تمہاری جان کے ساتھ تمہارے کام پورے ہوئے مگر ہاں۔ بدنامی کے چھینٹے تمہاری قبروں پر چھائے ہوئے ہیں۔ تمہارے مشیر و صلاح کار خود غرضی و دل آزاری ابھی زندہ ہیں اور بزم دُنیا میں تمہارے اوپر ٹھٹھے لگا رہے ہیں۔

ان ہی اینٹ پتھروں کے ساتھ ٹہی ٹبری سلوں کے نیچے ایسی صورتیں چھپی ہیں جن کی خاک کا ایک ایک ذرہ گوہر آبدار کی طرح چمک رہا ہے۔ کارخانہ قدرت کے پکے اصول ان کا سلسلہ حیات منقطع کر چکے۔ مگر ان کے مبارک نام چمنستان حیات میں شاداب پھولوں کی طرح لہلہا رہے ہیں۔ عالم امکان ان کی خوشبو سے معطر ہے۔ خلوص و صداقت کے ٹھنڈے اور میٹھے چشمے ان بارآور پودوں کو سینچ رہے ہیں۔

اے منزلِ مقصود پر پہونچ جانے والو تم دنیائے ناپائدار سے رخصت ہوئے۔ تمہارا نام صفحۂ ہستی سے مٹ چکا۔ تمہاری ہڈیاں خاک ہو چکیں۔ مگر پردیسی مسافرو تمہارا زمانہ قیام نعمت و برکت تھا۔ تمہاری زندگی ایسے گلہائے رنگین سے آراستہ تھی جو قیامت تک نہ مرجھائیں گے۔ تمہارا نام چمنستانِ قدرت میں گلِ خوش رنگ ہو کر کھلا اور بساطِ زندگانی میں بقائے جاودانی کی خوشبو سے ممتاز ہوا۔ تمہارے ٹوٹے پھوٹے مزارات زردوں کی خواب گاہیں چمن کے آگے قمر جہاں و بم ماند ہے۔

آج یلغاری قبرستان میں بزمِ شہدا سجی ہوئی ہے۔ وضعداری کے ہار گلے میں پڑے ہیں۔ سچی محبت کے طرّے سروں پر ہیں۔ ایک کشتیٔ زرنگار خونِ ناحق کے خوان پوش سے ڈھکی بیچ میں رکھی ہے جس میں اخلاق و محبت کا سہرا چُنا ہے۔ بڑے بڑے وفادار بیٹے اپنے وضعدار آغا کے لال ذراج بدنصیب کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔

سولی کا تمام سامان تیار ہو گیا۔ ذراج بدنصیب بچی کو کلیجے سے لگائے بیٹھا تھا۔ شہباز کے حکم سے ایک شقی القلب محافظ نے شعبانہ کو باپ کی گود سے چھینا اور زبردستی پکڑ کر علیحدہ کرنے لگا۔ وہ نہایت ستم انگیز وقت اور دردناک سماں تھا۔ بچی باپ کو چمٹی ہوئی چیخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی :-

"بابا! بابا! بابا! کجّا میروی؟"

لیکن وہ سنگدل محافظ گھسیٹ کر الگ کر رہا تھا۔ آخر کار زبردستی اور بزور و ظلم جھٹکا دے کر الگ کر دیا۔ بچی مجبور باپ معذور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ شعبانہ بلک رہی تھی اور محافظ سے منت کر رہی تھی :-

"آغا! چرا نمی کنی؟"

ایسے حسرتناک موقعہ پر جہاں بچے اور بڈھا سب کی آنکھ سے آنسو جاری تھے ذراج نے شہباز کی طرف دیکھ کر کہا :-

"وزیر اعظم! چھ بچوں میں یہ ایک بچی بچی تھی جو آپ کے ہاتھوں آج ہمیشہ کے واسطے جدا ہوتی ہے۔"

سواری شاہین کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ شیبانہ چیختی چلاتی رہی اور شہباز دراج کو سولی پر لے گیا۔

شہزادی نے مقتل میں داخل ہوتے ہی وزیر کو حکم دیا۔

"دراج سے پوچھو کوئی آخری درخواست ہے۔"

وزیر نے آگے بڑھ کر دراج کو حکم سنایا جس کے جواب میں اس نے باآواز بلند کہا:۔

"ہاں ہے! اور وہ یہ کہ اس وقت بھی شہزادی کی صورت نہ دیکھوں۔"

اب کیا باقی تھا۔ اسی حالت غیظ و غضب میں اجازت دی۔ اور چشم زدن میں دراج کا خاتمہ ہو گیا۔

دراج کا کام تمام ہونے کے بعد شاہین واپس جانے کو تھی۔ کہ جلاد نے حاضر ہو کر ایک پرچہ دیا۔ اور کہا:۔

"یہ مقتول کی وصیت ہے۔"

وہیں کھڑے کھڑے کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا:۔

آہ! ملکہ گل اندام! دراج بدنصیب اب اس قابل نہ رہا کہ شہزادی کے پہلو میں جگہ پائے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہے اور تقدیر نے تمام خواہشوں کا خاتمہ کر دیا۔ شاہین! ہائے شاہین! مرض مقدوری نے جیتے جی مردہ بنا دیا اور اس لائق نہ رکھا کہ تیرے حکم کی تعمیل کر سکوں۔

خوبیوں بھری ملکہ! دل گوارا نہیں کرتا کہ دراج کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور شاہین کو آزار ہو۔ میری بے گناہی کا یقین کر۔ بے قصور ہوں اور دل سے مجبور! خدا اس وقت سے پہلے مجھ کو موت دے کہ میں سامنے آ کھڑا ہوں۔ اور میری ہوا تجھ تک پہونچے۔ دل تڑپ رہا ہے۔ زبان نکل رہی ہے۔ کلیجہ پر چھریاں چل رہی ہیں

ارمان ہے کہ کسی طرح ایک دفعہ صورت اور دیکھ لوں۔ مگر نہیں نہیں۔ شاہین گل اندام یہ تقاضائے محبت نہیں ہے۔

الحمدللہ دعویٰ محبت پورا ہوا اور دُرّاج بدنصیب اپنی شہزادی پر قربان۔ ملکہ دُنیا کی خوبیاں تیرے ساتھ۔ ترقی اقبال روز افزوں ہو۔ میرا غم نہ کیجیو۔ سچا فرمانبردار تھا جان نثار کر دی۔

شاہین! دُنیا فانی ہے۔ کوئی چیز قایم رہنے والی نہیں۔ میں مر چکا ہوں گا جسد خاکی گل چکا ہوگا۔ مگر چشم تامل سے دیکھنے والے پرکھ لیں گے۔ کہ دُرّاج بدنصیب محبت کی کسوٹی پر پارس کی طرح چمکا۔ اور کندن کی طرح نکلا۔ تقدیر کی خوبی تھی۔ کہ شہباز نے دوستی کے پردے میں دشمنی کی۔ مگر از بنا جعل ساز نکلا۔ بہر حال میں خوش نصیب ہوں۔ کہ ارمان پورا ہو گیا۔ اور آج دُرّاج اپنی محبوبہ پر فدا ہوا۔

دکھیاری ماں جس نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا۔ اور جس کی تقدیر میں جوان بیٹے کا داغ لکھا تھا۔ ممتا کی ماری مقتل میں آئے گی۔ اگر قتل کے بعد غصہ فرو ہو جائے تو یہ بیکار جسم جو اُس کی تیس اکتیس برس کی امانت ہے۔ اُس کو دے دیا جائے کہ زندہ دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ مردہ دیکھ کر تسکین ہو۔ اور دُرّاج بے گناہ کی لاش پیوند زمین ہو جائے۔ آہ ملکہ! آہ شاہین۔ ہائے شہزادی اب کلیجہ اُڑا چلا آتا ہے میری خطا معاف میرے قصور سے درگزر۔ میری غلطی سے چشم پوشی میری تابعداری کا یقین میری وفاداری کا اعتبار۔ بس ملکہ فی امان اللہ۔ خدا تیرا نگہبان اور حافظ"

صرف اس نمک حلالی کے کارن دُرّاج بدنصیب پر جو گزرنی تھی گزر گئی۔ وہی دُرّاج جو کل ملکہ شاہین کے گلے کا ہار تھا آج اُس کے ہاتھوں ہمیشہ کے واسطے ختم ہو گیا اس میں کلام نہیں کہ بات کے دھنی نے وہ کام کیا۔ کہ سچی محبت

ملکۃ العراسما کے نام پر آنسو بہائے اور گو شاہین نے شہباز اور اس کے خاندان
کو زر و جواہر سے مالا مال کر دیا۔ لیکن اتنا افسوس ضرور ہے کہ ملکہ کے دامنِ عصمت
پر اس بے گناہ کے خون کا دھبہ بہت برا لگا۔ دل کیا تھا نذر اور ہاتھ پکڑ اٹھا۔
تو لالچ دیکھتی ہے مگر عورت ذات، دل کی بودی ارادے کی کچی۔ اچھی قدردانی کی کہ
جان ہی سے کھویا۔ ذوراج کی موت کیسی ہی عبرت ناک کیوں نہ ہو مگر پھر بھی اس
لحاظ سے ضرور بہتر تھی کہ وہ خاک میں مل کر تمام مصیبتوں سے چھوٹ گیا۔ اس
بدنصیب کو کیا خبر تھی کہ یہ اتنی بڑی آدمی آخر وقت طوطے کی طرح دیدے بدل جائے
گی۔ کسوٹی پر رکھا تھا تو پرکھ کر دیکھتی اور ایسی بدگمان نہ ہوتی کہ جان ہی سے
کھویا۔ تاہم ذوراج کی محبوبہ تھی۔ اب بھی ہمارا دل نہیں چاہتا کہ شاہین کو برا کہیں
شہزادی تھی تو ہو، ناقص العقل تھی۔ اعتبار نہ کیا اور بیلی گھونسے کا اچھل جانے
دیا۔ محبت کا فدائی شہزادی سے ملنے کا ارمان جی میں لے گیا۔ دعا ہے کہ خدا اس
کی حالت پر رحم کرے اور امید کے ساتھ یقین ہے کہ منصفِ حقیقی اس کی
آرزو پوری کرے گا اور حور پروں کے بدلے شاہین اس کی مطلوبہ اس کی ملکیت ہو گی۔
بکرے کی ماں کب تک خیر منائے جب تک شاہین کی آنکھوں پر غفلت کا
پردہ پڑا رہا شہباز چکیوں پر چھکے دیتا رہا اور داؤں کرتا رہا۔ مگر جلاد کا بچہ
لا کر دیتا تھا چوہدری کی ڈاڑھی میں تنکا۔ شہباز کا خون خشک ہو گیا۔ لاش کو جا کر
دیکھا انگوٹھی ہاتھ میں اور رومال جیب میں۔ وزیر کو ساتھ لے کر ذوراج کے گھر آئی۔
مرض کی مفصل کیفیت دریافت کی۔ طبیب کو بلوایا تو معلوم ہوا وہ بھی شہباز
کی عیاری تھی۔ سچی پٹی اور چال چلائی۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ
گئیں کھیت۔ نمک حرام وزیر کو گرفتار کیا اور اسی مقتل میں سولی دے کر اس
کے ٹکڑے کر کے اور چیلوں کے حوالے کیے۔

آغا قندھاری اور شعبانہ دونوں دادی پوتیوں کو اشرفیوں سے تول دیا اور
ایک ہزار روپیہ ماہوار کا وظیفہ دائمی خاندان کے واسطے مقرر کر دیا۔ دراج
کو غسل دیا اور برہنہ سر قبرستان لے چلی شعبانہ آغا قندھاری دونوں ساتھ
تھے۔ اور ہزاروں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ اس مجمع میں علی الاعلان دراج کی وفاداری
اور نمک حلالی پر خون کے آنسوؤں سے روئی۔ اور مغرب کے قریب اس محبت
کے بندے کو ہمیشہ کے واسطے زمین کے سپرد کر دیا۔

---

# راشد الخیری مرحوم کی دیگر کتب

| | |
|---|---|
| صبح زندگی | 2/- |
| شام زندگی | 1/8/- |
| شب زندگی (کامل) | 2/8/- |
| ماہ عجم | 2/- |
| آفتاب دمشق | 2/- |
| درشہوار | -/12/- |
| جوہر قدامت | 2/4/- |
| سنجوگ | -/12/- |
| طوفان حیات | 1/12/- |
| ستونتی | -/12/- |